کے رسول نمبروں سے زیادہ بلند پایہ، جامع اور سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہے۔

جنرل سائنس مرتبہ مولانا عزیز احمد قاسمی بی اے، جامعہ، تقطیع کلاں، کاغذ و کتابت و طباعت اچھی، صفحات: ۱۴۸- قیمت: للعہ، پتہ بک ڈپو دیوبند۔ یو۔ پی۔

لائق مصنف دار العلوم دیوبند میں جنرل سائنس اور انگریزی کے استاذ ہیں، یہ کتاب انھوں نے مبتدیوں اور عربی خواں طلبہ کی جنرل سائنس کے مبادیات اور بنیادی مسائل سے واقفیت کے لئے لکھی ہے، اس میں پہلے طبعیات و کیمیا کے سلسلہ میں مادہ کی حقیقت و اقسام، ہوا، بجلی، پانی، اور نور کی ماہیت، اُن کے اجزاء و عناصر اور آخر میں حیاتیات (حیوانات اور نباتات) کی خصوصیات، کیفیات، اور قسموں کے بارہ میں بنیادی اور ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں، اور جا بجا سائنسی مسائل کے ساتھ دینیاتی مباحث بھی ٹانک کر دونوں میں تطبیق کی گئی ہے، یہ موضوع خشک تھا لیکن مصنف کے انداز تحریر نے اس کو دلچسپ بنا دیا ہے آخر میں جنرل سائنس کے اصطلاحی انگریزی الفاظ کے اردو تلفظ و معنی دیئے گئے ہیں، عربی مدارس میں جدید علوم و مضامین کے مبادی کی تعلیم دینے کا اہتمام، اور دار العلوم دیوبند کی طرح اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ض)

جلد ۱۰۸ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۱ء عدد ۳

مضامین

شذرات

بعض چیزیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور حقیقت ہوتی ہیں، اگر ان کو دائرے میں رکھا جائے تو ان سے بڑے مفید کام لیے جا سکتے ہیں، لیکن انکے غلط استعمال سے اسی قدر مہلک نتائج بھی نکلتے ہیں، اسکی مثال آزادی، وطنیت اور قومیت ہے، آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جس سے اسکو کوئی طاقت محروم نہیں کر سکتی، اسلام میں انسانی آزادی کی اتنی اہمیت ہے کہ اس نے اس کو خدا کی بندگی کے سوا ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا، اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا، لیکن اگر آزادی، مذہب، قانون، اخلاق، انسانی شرافت اور تہذیب و شائستگی سے آزادی کا نام ہے تو یہ انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت اور اس کی تباہی کا پیام ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آجکل آزادی محض سیاسی آزادی کا نہیں بلکہ ہر قید و بند سے آزادی کا نام ہے جس سے زندگی کا کوئی شعبہ بھی مستثنیٰ نہیں، گھر کی چار دیواری سے لیکر سیاست کے میدان اور حکومت کے ایوانوں تک آزادی کا ایک طوفان بپا ہے، مذہب و اخلاق تو فرسودہ ہو چکے، ان کا تو سوال ہی نہیں، ملکی قوانین کا بھی احترام باقی نہیں ہے، قانون شکنی اور ہنگامہ آرائی کا نام آزادی بن گیا ہے، اور یہ لعنت سب سے زیادہ نو آزاد ایشیائی ملکوں میں ہے، جہاں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں، اشخاص اور افراد میں اس کو شخصی آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اولاد ماں باپ سے، بیوی شوہر سے اور شاگرد استاد سے آزاد ہے، کسی کو ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں کہ یہ شخصی آزادی میں مداخلت ہے، آزادی کے اس تصور نے یورپ کی خانگی زندگی اور وہاں کے نوجوانوں کے اخلاق کو جس قدر تباہ کیا ہے اس سے سب واقف ہیں، اب ہندوستان کے سپوت بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اور ان کے ہاتھوں آئے دن

ان کے بزرگوں اور استادوں کی جو درگت بنتی رہتی ہے اور تعلیم گاہوں میں جو ہنگامے بپا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب کے سامنے ہے،

حالانکہ آزادی اگر ایک طرف انسانوں کو اپنے ہم جنسوں کی غلامی سے آزاد کرتی ہے تو دوسری طرف قانون اور اخلاق کی پابندیوں سے جکڑ دیتی ہے، ورنہ معاشرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، بے لگام آزادی نری حیوانیت ہے، بلکہ حیوان بھی جبلی قوانین کے پابند ہوتے ہیں اور اشرف المخلوقات ان سے بھی آزادی چاہتا ہے، جس پر یورپ اور امریکہ کی حیوانی تحریکیں شاہد ہیں، تہذیب و شائستگی مطلق آزادی کا نہیں بلکہ پابندیوں کا نام ہے، جو انسان جس قدر ذمہ دار ہوگا، اسی قدر پابندیوں سے گرانبار ہوگا،

یہی حال قومیت اور وطنیت کے موجودہ تصور کا ہے، اپنی قوم اور وطن سے محبت بالکل فطری اور ان کے حقوق کی ادائیگی ایک فریضہ ہے، اس لیے مذہب نے بھی اس کی تعلیم دی ہے، لیکن یورپ نے جس قومیت اور وطنیت کا صور پھونکا ہے اور اس کو پرستش کی جس حد تک پہنچا دیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ جارحیت ہے، یہ قومیت اور وطنیت محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت و ہوا خواہی تک محدود نہیں، بلکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کی سیاسی و معاشی برتری بھی ضروری ہے، اس کا لازمی نتیجہ اقوام عالم میں کشمکش اور کمزور قوموں کی پامالی ہے کہ اس کے بغیر برتری حاصل نہیں ہو سکتی، خود یورپ میں اس نیشنلزم نے کیسی کیسی لڑائیاں برپا کیں، موجودہ بڑی قوموں کی ساری کشمکش اسی کا نتیجہ ہے، اور اب یہ دیو اتنا بے قابو ہو گیا ہے کہ "بقائے باہم" اور "پنچ شیل" کی کمزور زنجیروں سے قابو میں نہیں آتا۔

یورپ جہاں چھوٹے چھوٹے ملک اور چھوٹی چھوٹی قومیں آباد ہیں، جن کی نسل، مذہب، زبان اور تہذیب ایک ہے، ایک حد تک قومیت اور وطنیت مفید اور قومی وحدت کا ذریعہ ہے، لیکن بڑے ملکوں کے لیے جن کی نسلیں، زبانیں، مذہب اور کلچر مختلف ہیں، قومیت اور وطنیت دو دھاری تلوار ہے، جس سے قومی وحدت کم پیدا ہوتی ہے، اختلاف و افتراق زیادہ بڑھتا ہے،

جب قومیت نسل میں اور وطنیت جغرافی حدود میں محدود ہوگی تو ان ملکوں میں جنکی حیثیت ایک براعظم کی ہے، جن کی آب و ہوا، مذاہب، نسلیں، زبانیں اور تہذیب جدا جدا ہیں ان کے لحاظ سے ان کی قومیت اور وطنیت بھی سمٹتی اور محدود ہوتی جائے گی، اور ہر خطہ اپنی زبان اور تہذیب وغیرہ کے لحاظ سے اپنی جداگانہ حیثیت کا طالب ہوگا، جس کی ابتدا حقوق کی طلب سے ہوتی ہے، اور انتہا مرکز سے علٰحدگی پر، پاکستان کا انقلاب اس پر شاہد ہے، مشرقی و مغربی پاکستان کی جنگ خواہ مغربی پاکستان کی اقتدار پسندی اور احساس برتری کا نتیجہ ہو یا مشرقی بنگال کی لسانی اور نسلی عصبیت کا، بنیاد دونوں کی قومیت و وطنیت ہے، ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بھی اس کی صدا بلند ہونے لگی ہے، اور اندیشہ ہے کہ آئندہ چل کر یہاں بھی یہ صورت پیش نہ آئے۔

چھوٹے ملکوں میں بھی اگر نسلی قومیت ایک ہو اور جغرافی وطنیت الگ الگ ہو تو قومیت کا اشتراک و اتحاد نہیں پیدا کر سکتا، اس کی مثال عرب ملک ہیں، ان سب کی نسل ایک ہے، زبان ایک ہے، مذہب ایک ہے، تہذیب ایک ہے، مگر جغرافی وطنیت نے انکا شیرازہ بکھیر کر رکھدیا ہے، اور اتحاد کی کوئی کوشش آجتک کامیاب نہ ہو سکی، یہ سب آزادی، نسلی قومیت اور جغرافی وطنیت کے غلط تصور کا نتیجہ ہے، جس قومیت اور وطنیت کی بنیاد نسل پرستی اور وطن پرستی پر ہوگی اسکو قومیت اور وطنیت کے وسیع تصور اور اخلاقی اصولوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا، اسکا دائرہ برابر سمٹتا جائیگا، اور آئندہ چل کر بڑے بڑے ملک مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائینگے اور انکی وحدت ختم ہو جائیگی، اسلیے جبتک قومیت اور وطنیت کے اس غلط تصور کو ختم نہیں کیا جائیگا اسوقت تک انسانی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اسکا احساس ہر ملک کے مفکرین کو ہے، اور اسکی آوازیں بھی بلند ہوتی رہتی ہیں، اسی لئے اسلام نے ابتدا ہی سے اس قسم کی قومیت اور وطنیت کی جڑ کاٹ دی تھی اور اس کو ایک حد کے اندر محدود کر دیا تھا۔

افسوس ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی نے وفات پائی، وہ ادب کے استاد تھے، عربی زبان و لغت پر انکی نظر بڑی گہری و وسیع تھی، انھوں نے لغت کی کئی کتابیں لکھیں، ان میں مصباح اللغات اور اردو عربی ڈکشنری چھپ گئی ہیں، بعض مسودے کی شکل میں ہیں، دینی علوم میں بھی پوری دستگاہ رکھتے تھے، انکی پوری زندگی عربی زبان کی تلاش و تحقیق میں گذری، انکی وفات سے عربی زبان کا ایک بڑا ماہر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

ملا عبدالقادر بدایونی

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

ملا صاحب کا قلم علمائے سوء، اکبر کے دین الٰہی، اور اس کے مریدوں اور معتقدوں کے خلاف ضرور تیغ برہنہ ہو گیا ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ ابوالفضل نے اپنی انشا پردازی کے زور سے اکبر کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی جو گنگا بہائی تھی، اس کے پانی کو ملا صاحب نے اپنی تحریر کی قوت سے تلخ بلکہ زہرناک بنا دیا، اس لحاظ سے ابوالفضل کا قلم ملا صاحب کے قلم سے شکست کھا گیا ہے، اکبر کا دین الٰہی زیادہ تر ملا صاحب کی تحریروں ہی کے ذریعہ سمجھا گیا، کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ پورے وثوق کے ساتھ لکھا، ابوالفضل کے گومگو طرز بیان کے مقابلہ میں ان کے بیانات میں کوئی شک کی گنجایش نظر نہیں آتی، دونوں کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل کا ضمیر اکبر کے دین الٰہی پر خوبصورت الفاظ کا ایک پردہ ڈالنا چاہتا ہے، اور ملا صاحب اسی پردے کو چاک کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں،

اگر دین الٰہی اور اس کے مریدوں سے متعلق تحریروں کی تلخی اور صاف گوئی کو نظر انداز کر کے منتخب التواریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملا صاحب نے اس دور

میں بیٹھ کر جو تاریخ لکھی وہ موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہے، اس بے تکلف انداز میں اس زمانہ میں کوئی اور تاریخ نہیں لکھی گئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں ملا صاحب کی جابجا چٹکیاں لی ہیں، لیکن ان کی منتخب التواریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ انھوں نے اس میں غیر کی یا اپنی کوئی بات نہیں چھپائی ہے (دربار اکبری ص ۴۴۷) صاف گوئی اور حق پسندی ان کی فطرت میں تھی، اسی لیے انھوں نے جب اپنے عشق کا ذکر کیا ہے تو اس پر بھی کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے، اور اس عشق کو شہوت و آز سے تعبیر کر کے اپنے اوپر بھی لعنت بھیجی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو درگت بنی اس کو بھی صاف صاف لکھ دیا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے،

تاریخ نویسی میں ان کی یہ صاف گوئی جہانگیر کو پسند نہ آئی تھی، کیونکہ اس سے اکبر کی ایک بری تصویر سامنے آتی تھی، اس لیے اس نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کر دی تھی[1] لیکن اس کتاب پر سب سے اچھا تبصرہ الیٹ کا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جس کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا، لیکن اس کے لیے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہم عصر تاریخوں سے کامل واقفیت بھی چاہیے، کیونکہ مصنف نہ صرف الفاظ استعمال کرتا ہے، بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف و توصیف، ہجو و ذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں، بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کا

[1] لہ [illegible] جلد اول ص ۲۹

کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں"۔ (الیٹ جلد ۵ ص ۴۸۱)

یہ صحیح ہے کہ اس میں تعریف و توصیف کے ساتھ ہجو و ذم بھی ہے، ہم اس کی تھوڑی سی مثالیں دے چکے ہیں، لیکن پوری کتاب میں ہجو و ذم کا پہلو کم نکلے گا، تیسری جلد جو چار سو صفحے پر مشتمل ہے، مشائخ، علماء، اطبا اور شعراء کی مدح ہی مدح ہے۔ ملا صاحب کی تینوں جلدوں کے ماخذ ان کے ذاتی مشاہدات کے علاوہ ان کے بیان کے مطابق صرف دو[2] کتابیں ہیں، ایک تو خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی تاریخ طبقات اکبری ہے، جس کو وہ نظام التواریخ لکھتے ہیں، اور دوسری بخشی ابن احمد بن عبداللہ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی ہے، (دیکھو دیباچہ منتخب التواریخ)، لیکن ان ہی دو کتابوں کے سہارے انھوں نے اپنی یہ ضخیم جلدیں تیار کر دیں، جن میں ان کی قوت اخذ کے طرح طرح کے جلوے نظر آتے ہیں، وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ تاریخ لکھتے وقت اختصار سے کام لیا ہے، اور عبارتی تکلفات اور استعارات سے پرہیز کیا ہے (ج ۲ ص ۶) یہ گویا ابوالفضل کی انشاء پردازی پر ایک قسم کی ضرب ہے، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کے قلمبند کرنے میں انشاء پردازی کا سہارا نہیں لیا، بلکہ ان کی انشاء پردازی خود تاریخی واقعات کو قلمبند کرنے میں سہارا بنتی چلی گئی، جس سے ان کی قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر الفاظ لا کر اپنی تحریروں کو سجانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی کتاب زمانہ کی زبان (زبان روزگار) میں لکھ کر عام آدمیوں کے لیے بھی مائدۂ افضال بچھایا ہے، جس کو ابوالفضل پسند نہیں کرتا تھا، (جلد دوم ص ۳۰۱)

وہ دربار کے امراء اور علماء کا ذکر کرتے وقت ان سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی

کو بھی اظہار کرتے جاتے ہیں، خواہ ناظرین ان کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں، لیکن انکے اس ناقدانہ انداز بیان سے اُن کا طرز دلچسپ ہو جاتا ہے، کہیں کہیں تو ان کا اتنا استعمال آگیا ہے کہ وہ ہرزہ سرائی پر بھی اتر آتے ہیں، وہ تو اپنی اس جھلاہٹ کو دینی درد اور دلسوزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن موجودہ دور کے ناقدین اس کو ان کے مذہبی تعصب کی شدت پر محمول کرتے ہیں، مگر ان کا یہ غصہ بلکہ ان کے قلم کا کچھ کاپن ان کی تحریروں کو بعض اوقات جاندار بھی بناتا رہتا ہے۔

وہ تصنع اور آورد سے دور رہ کر بے تکلفانہ انداز میں واقعات کی ترتیب دیتے چلے جاتے ہیں، جس سے رزم اور بزم دونوں کی مرقع آرائی میں جان پڑتی نظر آتی ہے، اکبر کی فوج اور میواڑ کے رانا سے جو لڑائی ہوئی، وہ اس دور کی بڑی اہم معرکہ آرائی تھی، اکبر کی طرف سے مان سنگھ اس کی فوج کی سربراہی کر رہا تھا، ملا صاحب خود اس مہم میں شریک رہے، انھوں نے میدان جنگ کی جو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی جنگی نامہ نگار تمام واقعات کو قلمبند کر رہا ہے، اس سلسلہ میں ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

فیلان رانا مقابل فیلان افواج بادشاہی در آمدہ ازاں جملہ دو فیل تومست نامی با یکدیگر در افتادند، و حسین خان فوجدار فیلان کہ عقب مان سنگھ بر فیل دیگر سوار بود نیز افتاد و مان سنگھ بجائے مہاوت بر ان فیل خود سوار شد، و ثبات قدمی ورزید کہ فوق آن متصور نباشد و یکے ازاں دو فیل کہ یکے خاصہ بادشاہی بود....

جنگ عظیم کردہ و ہر دو یکدیگر را می راندند، از قضا بمقتل فیلبان فیل رانا تیر رسید و از صدمۂ حملۂ فیلان بر زمین افتاد و فیل بان فیل بادشاہی بچستی و چالاکی از فیل

خود جستہ بر فیل رانا نشست، و کاری کرد کہ ہیچ کس نکند و از مشاہدۂ این حال رانا تاب نتوانست آورد و عطوبا ماندہ روان شد و تذبذب در افواج را افتاد و جوانان یکہ کہ ان راہ موافقت می نمودند، پیش در آمدند چپقلشی کردند کہ کارنامہ بود و از سر داری مان سنگھ آن روز معلوم شد کہ این مصرع ملا شیری چہ معنی داشت

کہ ہندو می زند شمشیر اسلام (ج ۲ ص ۲۳۳)

بزم کی تصویر بھی کھینچنے میں ان کے قلم میں بڑا زور آجاتا ہے، اکبر کے عبادت خانہ کی مرقع آرائی تو طرح طرح سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں اس مباحثہ میں نبوت، کلام، رویت، تکوین، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے، طرح طرح کے شبہات وارد کیے جاتے، ہر ایک کا تمسخر اور استہزا کیا جاتا، اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تو اس کو روک دیا جاتا، اس طرح مناظرہ میں ثابت کرنے والے کے مقابلہ میں انکار کرنے والے کا پلہ بھاری رہتا، پھر اسی سلسلہ میں سارے مناظرے کو یہ کہکر باطل قرار دیدیتے ہیں:-

خانمانہا بر سر این مباحثہ رفت و حاشا کہ این مباحثہ باشد بلکہ مکابرہ و مشاغبہ بود و دین فروشان برائے خوش آمد و شکوک متردک را از ہر جا پیدا کردہ بہ تحفہ می آوردند" (ج ۲ ص ۳۰۷)

اور پھر اس عبادت خانہ کے آخری نتائج کی نقشہ آرائی اس طرح کرتے ہیں جس میں دردناکی بھی ہے اور دل سوزی بھی (ج ۲ ص ۳۰۸-۹)

سنیان مغلوب و اخبار ہمہ جا خائف و اشرار امین بودند۔ ہر روز حکمی تازہ و قدحی جدید و شبہۂ نو بروی کار می آمد و اثبات خود در نفی دیگران دیدند، و ازین نکتہ کہ

برنا فی منفی می باشد و اہل بنا بر آن مقبولان مردود و مردودان مقبول و نزدیکان
دور و دوران نزدیک بودند سبحان من تصرف فی ملکہ کیف یشاء بزبان عام
کالانعام جز ورد اللہ اکبر چیزے دیگر نبود و غوغائے عظیم برخاست و ملا شیری دران
وقت قطعہ گفتہ مشتمل بر دہ بیت و این از آن جملہ است

تا بزاید ہر زمان کشود بر انداز آفتی — فتنہ در کوی حوادث کد خدا خواہد شدن
با عقاب قرض خواہ تیغ دار باب شرک — بار سر از ذمہ گردن ادا خواہد شدن
شورش معز است اگر در خاطر آرد جاہلی — کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زین بیت بس کز طرفگی — نقل بزم منعم و درد گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعوی نبوت کردہ است — گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

لیکن کچھ دنوں کے بعد ان مباحثہ کرنے والوں کو یاد کرتے ہیں تو پھر ان کی تحریر میں بڑی خستگی اور برشتگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور بڑے درد و گداز کے ساتھ لکھتے ہیں (ج ۲ ص ۸۹-۱۸۸)

مدت دہ سال از آن تاریخ الی الیوم گذشتہ و آن جماعۃ مباحثین و مناظرین
چہ محقق و چہ مقلد کہ از صد نفر متجاوز بودند یک کس نمی بیند و ہمہ روی در نقاب
کل نفس ذائقۃ الموت ماندند

جرت الریاح علی مکان دیارہم — فکانہم کانوا علی میعاد
ز خیل دردکشان غیر ما نماند کسی — بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسی

حالا کہ بمقتضای النعمۃ اذا فقدت عرفت ان ہم صحبتان را یاد کنند خونابۂ
حسرت از دیدۂ غم دیدہ فرو می بارد و می زارد و می نالد و می گوید کہ دریغ
حسرت آباد کاشکی روزی چند دیگر ہم اقامت می نمودند کہ بہر حال مغتنم بودند

و خطاب منحصر با ایشان بود

پائے ورز زنجیر پیش دوستان — بہ کہ با بیگانگان در بوستان

این پشۂ مغرور، و این نغمۂ معہود در اعتراز داغ حرمان و نالۂ پنہا
چہ درمان غفر اللہ الماضیین و رحم الباقین

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند — در پائے اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر — یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

ملا صاحب عربی کے بھی بہت بڑے عالم تھے، اس لیے اپنی تحریروں میں بکثرت عربی الفاظ، فقرے، ترکیبیں حتی کہ اشعار استعمال کرتے جاتے ہیں جن کو سمجھ کر وہی لطف لے سکتا ہے جو عربی بھی اچھی طرح جانتا ہو، اسی لیے الیٹ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ نامانوس الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، کبھی کبھی تو وہ ایسی عبارت بھی لکھ جاتے ہیں جو صرف فارسی جاننے والوں کے لیے بڑی گراں گزرتی ہے، مثلاً

این را بواعث و دواعی بسیار بود، و بموجب القلیل یدل علی الکثیر
والحفنۃ تدل علی البیدر انموذجی از آن در سلک تقریر و تحریر می آورد
واللہ المستعان حاصل آنکہ دانایان از ہر دیار و ارباب ادیان و مذاہب
بدربار جمع شدہ بشرف ہمزبانی مخصوص بودند (ج ۲ ص ۲۵۶)

ان کی تحریروں میں "تواوح"، "مطاعن"، "ملت سہلۂ بیضا"، "حنیفہ غرا"، "مظہر اسم المضل"، "مظہر اسم الہادی"، "ضال و مضل"، "علما نافعا و عملا مستقبلا" وغیرہ جیسے الفاظ بہت آتے ہیں، لیکن اس قسم کے الفاظ مذہبی مباحث کے سلسلہ ہی میں عموماً استعمال ہوتے ہیں، ان کو جب کسی سے جھلاہٹ آتی ہے تو اس کے لیے "ملعون"

سگ ملعون، ملاعین، ولد الزنا، بدبخت، فاسق، فاجر، ملحد، بے دین، بے حیا، پاجی طبیعت، پاجیاں، مردود، مطرود، مکار، دنیا ساز، رذیل، خبیث، مردم ارذال وسفلہ وغیرہ جیسے الفاظ لکھنے پر اتر آتے ہیں،

منتخب التواریخ کی تیسری جلد ان کی تحریر کا شاہکار ہے، اس میں ان کے طرز بیان میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس سے انشراحی کیفیت بھی محسوس کرتے جاتے ہیں، خصوصاً مشائخ اور علماء کے توکل، قناعت، عبادت، ریاضت، زہد، تقویٰ، معرفت الٰہی، استغناء، گوشہ نشینی، علمی تبحر وغیرہ کے ذکر میں تو ان کے قلم میں بڑی گرمی اور ان کے قلب میں بڑی حرارت پیدا ہوتی نظر آتی ہے، ان کی ہر سطر سے ان کے ادب و احترام کا اظہار بھی ہوتا ہے، انکی کتاب کا یہ حصہ اس دور کی علمی و مذہبی تاریخ کا بڑا بیش بہا خزانہ ہے،

وہ شعر و ادب کے بڑے اچھے نقاد بھی تھے، جیسا کہ ان کی اس تیسری جلد کے اس حصہ سے اندازہ ہوگا جہاں وہ اپنے زمانہ کے شعراء کا ذکر کرتے ہیں، اس نقد و تبصرہ میں کچھ چٹکیلی باتیں لکھ کر مزاحیہ رنگ بھی پیدا کر دیا ہے، مثلاً قاسم کاہی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس کو کتوں سے بڑا پیار تھا، غالباً کتے سے پیار ملک الشعرائی کا لازمی شیوہ ہے، یہ اشارہ ملک الشعراء فیضی کی طرف ہے، اس کو بھی کتوں سے بڑا لگاؤ تھا،

اختلاط با سگاں بے تحاشی داشت، غالباً ایں شیوہ لازمۂ ملک الشعراء بودہ۔ (ج ۳ ص ۱۷۳)

سانبر کے راجہ لون کرن کا بیٹا منوہر تھا، فارسی میں شاعری بھی کرتا، اس کا تخلص توسنی تھا، ملا صاحب اسکے بارہ میں لکھتے ہیں کہ سانبر کا نمک زار مشہور ہے، توسنی کے کلام

میں بھی بڑا نمک ہے، وہاں کا سارا نمک اس کے کلام میں چلا آیا ہے،

منوہر نام دارد ولد لون کرن راجہ سانبر است کہ نمک زار مشہور است

وایں ہمہ نمک در سخن او تاثیر آں سرزمین است (ج ۳ ص ۲۰۱)

بیرم خاں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک رات کی مجلس میں وہ ہمایوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی، ہمایوں نے اس سے کہا ہاں بیرم تم سے کچھ کہہ رہا ہوں، بیرم نے جواب دیا، ہاں بادشاہ سلامت، میں حاضر ہوں، لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے حضور میں آنکھوں کی حفاظت، درویشوں کے نزدیک دل کی نگہداشت، اور عالموں کے سامنے زبان کی احتیاط کرنی چاہیے، میں یہی سوچ رہا تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی ہیں اور عالم بھی ہیں، کن کن چیزوں پر نگاہ رکھوں، بادشاہ کو یہ جواب پسند آیا، اور تعریف کی،

شبے ہمایوں بادشاہ مخاطبہ با بیرم خان داشتند او را بنا بر غنودگی دست داد بادشاہ بہ تنبیہ فرمودند کہ ہان بیرم با تو می گوییم، گفت بلے بادشاہ من حاضرم اما چون شنیدہ ام کہ در ملازمت پادشاہان محافظت چشم و پیش درویشان نگاہداشت دل و نزد عالمان حفظ زبان باید کرد، بنا براں دریں فکر بودم کہ چوں حضرت ہم بادشاہ و ہم درویش و ہم عالمند کدام را نگاہ تو انم داشت بادشاہ مغفرت پناہ را ایں ادا از و خوش آمد و تحسین فرمودند (ج ۳ ص ۱۹۲)

ایک شاعر سلطان پیسلکی کے متعلق لکھتے ہیں، سیلک قندھار کا ایک گاؤں ہے، وہ وہیں کا رہنے والا تھا، اس لیے لوگ اس کو پیسلکی کہتے، مگر ہندوستان میں پیسلکی ایک گھناونا جانور ہے، اس لیے اس تخاطب سے وہ بڑا تنگ آجاتا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ

ایک دن اس نے قاسم کاہی سے پوچھا کہ تمھاری کیا عمر ہوگی ؟ اس نے جواب دیا "خدا سے دو سال چھوٹا ہوں" سلطان سیلکی نے کہا "میرے مخدوم ! میں تو سمجھتا تھا کہ آپ دو سال بڑے ہیں، آپ اپنی عمر کم بتا رہے ہیں، قاسم کاہی یہ سن کر ہنس پڑا اور کہا کہ تم ہماری صحبت کے لائق ہو۔

روزیکہ ملا قاسم کاہی را دیدہ پرسیدہ کہ سن شریف چند باشد، قاسم گفتہ کہ از خدا دو سال خوردم، سلطان گفتہ کہ مخدوم ما شمارا دو سال زیادہ می دانستیم طولیت عمر خود را کم می فرمائید، ملا قاسم خندہ زدہ وگفتہ تو قابل صحبت مائی۔

(ج ۳ ص ۲۳۶)

فیضی اور عرفی کے ایک مشہور لطیفہ کو ملا صاحب کے قلم ہی نے مشتہر کیا، لکھتے ہیں، ایک دن عرفی شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا، فیضی اپنے کتے کے ایک پلہ سے کھیل رہا تھا، عرفی نے پوچھا کہ اس مخدوم زادہ کا کیا نام ہے، فیضی نے جواب دیا 'عرفی'، عرفی نے فی البدیہہ کہا "مبارک باشد"۔ فیضی کے والد کا نام مبارک تھا، اسلیے تلملا گیا لیکن خاموش رہا۔

(عرفی) روزے بخانۂ شیخ فیضی آمد، چوں سگ بچہ را با شیخ مخلوط دید پرسید کہ ایں مخدوم زادہ را چہ نام است، شیخ گفت عرفی، او در بدیہہ گفت "مبارک باشد" وشیخ بسیار برہم ودرہم شد، اما چہ فائدہ" (ج ۳ ص ۲۸۵)

انھوں نے بعض شعرا کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے بہت ہی دلچسپ اور چبھتے ہوئے فقرے بھی لکھے ہیں، مثلاً قاسم کاہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا سارا مضمون دوسرے شعرا کے یہاں سے لیا ہوا ہوتا ہے، لوگوں نے جب اس سے پوچھا کہ تمھارے اشعار کے اکثر مضامین دوسرے شاعروں سے ملتے ہیں، تو اس نے جواب دیا کہ میں شعر کہتے وقت

ایسا کوئی التزام نہیں کرتا ہوں کہ یہ سب اشعار میرے ہی ہوں، اگر تم کو پسند نہیں آتے ہیں تو قلم تراش لو اور میرے دیوان سے تراش کر ان کو نکال دو۔

ہمہ مضمون دیگران ...... چوں ملا قاسم را می گفتند کہ اکثر اشعار شما مضمون دیگر دیگران است، می گفت کہ من التزام نکردہ ام کہ ہمہ اشعار من باشد، اگر شمارا خوش نیاید، قلم تراش بگیرید واز دیوان من تراشید۔ (ج ۳ ص ۱۷۵)

ثنائی مشہدی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ جب تک وہ ہندوستان نہیں آیا تھا، یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو طرح بنا کر بزم آراستہ کرتے، اور ہر مجلس میں اس کے اشعار تبرک کے طور پر پڑھے جاتے، اور بالاتفاق اس کی استادی کے معترف رہے، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد سے اس کی عقیدت افسردگی میں تبدیل ہوگئی، وہ گوشۂ گمنامی میں پڑ گیا، اس پر اعتراضات کے تیر برسائے جانے لگے اور وہ حیرت کی وادی میں پڑ گیا۔

پیش از آنکہ بہ ہندوستان بیاید بزرگان ایں دیار بہ بیتے از و غائبانہ بزمی می آراستند و در ہر مجلس شعر او را بہ تبرک می خواندند و متفق الکلام والاقلام بہ استادی او خط می نوشتند چوں آمد آن ہمہ شوق از حسد بہ فسردگی مبدل شد و در گوشۂ مجہولی افتاد و نشانۂ صد تیر اعتراض بودہ حیران وادی سائر ناسی گردید (ج ۳ ص ۲۰۸)

فیضی جیسے باکمال شاعر کی شعر گوئی پر ملا صاحب کے تبصرے کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس سے ناظرین کو اتفاق کرنا ضروری نہیں لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کا قلم باغ و بہار بن کر جب قلم تراش بن جاتا...... پھر اس سے اپنی قلم تراشی کس کس طرح کرتے رہے۔

ملا صاحب کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی بڑی مہارت تھی، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

ان کے والد صاحب کی وفات ۹۶۹ھ میں ہوئی، تو یہ تاریخ نکالی: (ج ۱ ص ۵۳)

سرو فتر افاضل دوراں ملوک شاہ — آں بحر علم و معدن احسان و کان فضل

چوں بود در زمانہ جہانی ز فضل ازاں — تاریخ سال فوت ولے آمد جہان فضل

۹۶۸ھ میں بیرم خاں کی شہادت کے موقع پر انھوں نے بلحاظ تعمیہ یہ تاریخ نکالی:

گفت گل گلشن خوبی نماند

گلشن خوبی کے اعداد ۱۰۱۸ ہوتے ہیں، اس میں گل کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۹۶۸ ہو جاتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۴۸)

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ۹۷۱ھ میں خواجہ مظفر علی تربتی کو خاں کا خطاب دے کر وکیل کل کے عہدہ پر مامور کیا گیا، اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ "ظالم" ہے، غالباً یہ تاریخ انھوں نے خود نکالی۔ (ج ۲ ص ۶۵)

شیخ سلیم چشتیؒ ۹۷۱ھ میں حرمین شریفین سے ہندوستان واپس تشریف لائے، تو ملا صاحب نے اس موقع پر دو تاریخیں کہیں۔ (ج ۲ ص ۷۳)

شیخِ اسلام مقتدائے انام — رفع اللہ قدرہ السامی

از مدینہ چوں سوئے ہند آمد — آں ہدایت پناہِ نامی

ہند از مقدم ہمایونش — یافت از سر خجستہ فرجامی

گیر حرفے و ترک کن حرفے — بہرِ سالش ز شیخ الاسلامی

اسلامی میں سے ل نکالنے کے بعد ۹۷۱ھ ہو جاتا ہے، دوسری تاریخ یہ ہے:

شیخ اسلام ولی کامل — آں مسیحا نفس و خضر قدم

لامع از جبہۂ او سرّ ازل — طالع از چہرۂ او نور قدم

از مدینہ چو سوئے ہند شتافت — آں مسیحا نفس و خضر قدم

بشمر حرفے و شمر حرفے — بہر تاریخ ز خیر المقدم

خیر المقدم سے ۱۰۲۵ ہوتے ہیں۔ میم کے ۹۰ نکال دیے جائیں تو ۹۳۵ ہوں گے اور پھر "د" کے ۳۵ جوڑ دیے جائیں تو ۹۷۰ھ ہوتے ہیں، پھر بھی تاریخ درست نہیں ہوئی۔

۹۷۵ھ میں ملا صاحب کی دوسری شادی ہوئی تو اس کے لیے یہ تاریخ کہی (ج ۲ ص ۱۰۵)

چوں مرا از عنایت ازلی — اتصالے بماہ چہرے شد

عقل تاریخ کد خدائی را — گفت ماہی قرین مہرے شد

۹۷۶ھ میں فتح پور سیکری میں اکبر نے شیخ سلیم چشتی کے لیے مسجد اور خانقاہ بنوائی تو ملا صاحب نے عربی میں ان کی یہ تاریخ نکالی (ج ۲ ص ۱۰۹)

ہذہ البقعۃ قبۃ الاسلام — رفع اللہ قدر بانیہا

قال روح الامین تاریخہ — لا یری فی البلاد ثانیہا

یعنی یہ مسجد قبۃ الاسلام ہے، خدا اس کے بنانے والے کے رتبہ کو بلند کرے، روح الامین نے اس کی تاریخ یہ کہی، اس کا ثانی دوسرے ملکوں میں نہیں۔

ایک دوسری تاریخ یہ کہہ کر بھی نکالی۔

بیت معمور آمدہ از آسماں

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں پٹنہ فتح ہوا، تو ملا صاحب نے یہ تاریخ اکبر کی خدمت میں گذرانی (ج ۲ ص ۱۸۰)

چتر شہ دیں بہر کشاد پٹنہ — انداخت چو سایہ بر سواد پٹنہ

فی الحال رقم زد از پئے تاریخش — منشیِ خرد فتحِ بلاد پٹنہ

ملا صاحب اپنے زمانے کے ایک زاہد، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ شیخ

برہان سے بہت متاثر تھے، ان کی وفات ۹۹۰ھ میں ہوئی، تو یہ مادہ تاریخ نکالا

دل گفت کہ شیخ اولیاء بود (ج ۳ ص ۷)

۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں اپنی کتاب منتخب التواریخ ختم کی تو اس کا یہ مادہ تاریخ کہا

شکر للہ کہ با تمام رسید — منتخب از کرم ربانی

سال تاریخ ز دل جستم گفت — انتخابی کہ ندارد ثانی

لفظ "انتخاب" سے ۱۰۵۴ ہوتا ہے، لیکن "ن" کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۱۰۰۴ ہو جاتا ہے۔

ملا صاحب کو تاریخ گوئی سے بڑا ذوق رہا، اس لیے اپنی منتخب التواریخ میں دوسروں کے مادۂ تاریخ کو جا بجا درج کرتے گئے ہیں۔

ملا صاحب شاعر بھی تھے، اس لیے اسی شاعرانہ کمال کی بدولت شعر میں بھی مادہ نکال لیا کرتے تھے، ان کا تخلص قادری تھا، انھوں نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں شعراء کے تذکرہ میں اپنی شاعری کی تفصیل نہیں لکھی ہے، البتہ کہیں کہیں اپنے کچھ اشعار نقل کر دیے ہیں، مثلاً اپنے زمانہ کے ایک عالی مقام بزرگ میر سید علاء الدین اودھی کے ذکر (ج ۳ ص ۶۲) میں لکھتے ہیں کہ ان کی ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے:

کہ بچشمانِ دل مبیں جز دوست — ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اس سلسلہ میں وہ عرفی کا یہ شعر بھی نقل کرتے ہیں:

کہ جہاں صورت است و معنی دوست — در بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

پھر کسی (؟) اور شاعر کا یہ شعر بھی درج کرتے ہیں:

کہ جہان پرتو یست از رخ دوست — جملۂ کائنات سایۂ اوست

آخر میں لکھتے ہیں کہ اسی مضمون کا ان کا بھی ایک شعر ہے

اوست مغز جہان جہان ہمہ پوست — خود چہ مغز و چہ پوست چون ہمہ اوست

ملا صاحب کے ہم عصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے، شیخ ابن حجر سے درس حدیث کی سند لی تھی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، شعر بھی کہا کرتے ملا صاحب سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، ان کو ایک خط لکھا، تو اس میں ان کی تعریف میں یہ اشعار لکھ بھیجے، (ج ۳ ص ۱۴۴)

از دوانی بداونی بیشک — در فنون فضیلت است فزوں

پس دلیل زیادت معنیش — کہ بنائیش بصورت ست فزوں

ملا صاحب نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا:

اے زبانت کلید نامۂ غیب — دلِ پاکت نتیجۂ لاریب

دادہ اعجاز کلک تو بیرون — گنج ہائے نہاں کن فیکون

گفتی از منطق گہر پرور — کز دوانی بداونی خوشتر

گر دوانی و گر بداونیند — ہمہ از گنج فضل تو غنیند

دلم آئینہ جمال تو شد — مظہر فیض لایزال تو شد

چہ عجب گر ز روئے حق بینی — خویشتن را دلم ہمی بینی

اپنی منتخب التواریخ کے خاتمہ پر اپنی ایک مناجات بھی لکھی ہے جس سے انکی قلبی اور دینی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے، اس مناجات کے کچھ اشعار یہ ہیں، گو یا ان بہت ہی سلیس اور رواں ہے:

سراپا ز عصیان مرا پیش بیں — مبین جرم ما رحمتِ خویش بیں

نگہدار از من بد روزگار ز ہر بد کہ باشد مرا دور دار
چناں کار دنیا و دینم بساز کہ از ہر دو عالم شوم بے نیاز
بالطاف خود داریم در امان ز آفات و آشوب آخر زمان
براری مرادِ منِ مستمند ز دنیا و دین سازیم بہرہ مند
مکن در کف نفس بیچارہ ام اماں بخش از نفس امارہ ام
تمنا کنانم مبر پیش کس تمنای من از در تست بس
ز کسبِ حلالم بدہ توشۂ ز خلقِ جہاں گیریم گوشۂ
گنا ہم بیامرز و پوشیدہ دار کہ ہم ستر پوشی ہم آمرزگار
ز فیض ازل بخش آگاہیم خلاصی دہ از جہل و گمراہیم
نگہدارم از صحبت ناکساں بصاحب دلے اہل دردی رساں
سوئے خویش کن رہ بری بر مرا خلاصی دہ از ماسوی اللہ مرا
مکن بر مرادے مرا کامگار کہ خجلت مرا در سرانجام کار
نداند کسے جز تو بہبود من تو دانی زیانِ من و سود من
غنی کن ز گنج قناعت مرا حضوری دہ از ذوق طاعت مرا

ملا صاحب بڑے اچھے خطاط بھی تھے۔ سنہ ۱۰۰۲ھ میں کلام پاک کا ایک نسخہ خط نسخ میں لکھ کر شیخ داؤد جہنی وال کے روضہ میں رکھوا دیا، اور اس کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتے تھے، لکھتے ہیں:

ہم دریں سال حق سبحانہٗ عز شانہٗ کاتب را توفیق کتابت کلام مجید رفیق گردانید تا نسخۂ مردش و خوانا نوشتہ باتمام رسانیدہ ملوح جدول مکمل وقف روضۂ منورہ

حضرت غوث الانامی مرشدی ملاذی میاں شیخ داؤد جہنی وال قدس سرہٗ ساخت امید کہ کفارت گناہاں گذشتہ کہ چوں نامۂ اعمال بندہ سیاہ است گردیدہ مونس ایام حیات و شفیع لجہ ممات گردد۔ (ج ۲ ص ۳۹۴)

وہ قرأت بہت اچھی کرتے تھے، اس لیے موسیقی کے بھی ماہر ہو گئے تھے۔ وہ خود تو اس فن میں اپنی مہارت کا ذکر منتخب التواریخ میں نہیں کرتے، لیکن پہلے ذکر آیا ہے کہ فیضی نے ولایتی اور ہندی موسیقی میں ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے (ج ۳ ص ۳۰۰) اس فن میں اپنی بلندی کا اظہار یہ لکھ کر کیا ہے کہ جب اکبر نے شیخ بنجو، میاں تان سین اور دوسرے ارباب غنا کو شیخ مبارک ناگوری کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے فن کا جائزہ لیں تو شیخ مبارک ناگوری نے میاں تان سین سے کہا، ہم نے سنا ہے کہ تم بھی کچھ گا لیتے ہو، اور جب اس نے اپنا گانا سنایا تو اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دے کر اس کی کوئی اہمیت نہیں دی۔ (ج ۳ ص ۲۶۵)۔ ملا صاحب کے اس فن لطیفہ کے ذوق کے بعد یہ لکھنا نامناسب نہیں کہ ان کو غالباً حسن و جمال کا بھی غیر معمولی احساس رہا، اپنے عاشق و دلگیر ہونے کا حال خود بیان کیا ہے، اور منتخب التواریخ میں تو خاں زماں اور شاہم بیگ (ج ۲ ص ۲۰) سید موسیٰ اور موہنی (ج ۲ ص ۱۱۸-۱۰۹) ایک شیخ زادہ اور ایک طوائف (ج ۲ ص ۱۱۹) وغیرہ کے معاشقہ کی تفصیل بڑے لطف و لذت کے ساتھ قلمبند کی ہے۔ سید موسیٰ اور موہنی کے عشق و عاشقی کا حال لکھنے میں تو ان کا قلم بہت بے قابو ہو گیا ہے، لکھتے ہیں

الحمد للہ علی نعمۃ الایمان والاسلام، براذکیا معروض می دارد کہ اگرچہ بمقتضائے وعدۂ اختصار جائے اطناب دریں واقعہ نبود اماں چوں تواں کرد کہ سخن عشق

بے اختیار عنان قلم از قبضۂ اقتدار بیروں بردہ در از نفسی واقع شد

(ج ۲ ص ۱۱۸)

یہ کبھی اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

بشنو اے گوش بر فسانۂ عشق — از صریر قلم ترانۂ عشق

کار من عشق و یار من عشق است — حاصلِ روزگار من عشق است

چہ کنم در سرشتِ من این ست — وز ازل سرنوشتِ من این است

بہر ایں آفریدہ اند مرا — جانب این کشیدہ اند مرا

لیکن وہ کبھی کبھی عشق الٰہی میں سرشار ہو کر بدمست بھی ہو جاتے، ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں ان کو ایک بندۂ خدا مظہر سے تعلق خاطر ہو گیا،

تعلق خاطری عظیم بمظہری نام از مظاہر الٰہی و آزادی و وارستگی ..... ‘‘ (ج ۲ ص ۲۹۶)

اس لگاؤ کی وجہ سے ان پر بڑی مستی طاری رہی، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں (ج ۲ ص ۹۸-۲۹۷)

’’میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہوتا تھا، عاقبت اندیشی، نفع اور نقصان کی بالکل فکر نہیں رہی اور افوض امری الی اللہ (میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتا ہوں) میرے لیے پورا ہوتا نظر آتا،

تو با خدائے خود انداز کار و خوشدل باش

کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

میں اس عالم میں نیند میں اشعار کہتا، ایک رات نیند ہی میں یہ شعر کہا اور بیدار ہونے کے بعد اس کو یاد کر کے بیقرار اور روتا رہا،

آئینۂ ما روئے ترا عکس پذیر است — گر تو ننمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العزت کی قسم اس واقعہ کو سترہ سال گذر گئے، لیکن دل سے اس کی لذت ابتک نہیں گئی ہے، اجب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو رونے لگتا ہوں، کاش میں اسی وقت دنیا سے بالکل خالی ہو کر چلا جاتا، تو سارے جھگڑے سے پاک ہو جاتا۔

خوش آنکہ دید روئے ترا و سپرد جاں — آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھکو کوئی چیز معلوم ہوئی یعنی معرفت حاصل ہو گئی تھی، اور میرے دل تک ایسا فیض پہنچ گیا تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں اور شکر بجا لاؤں تو بھی اس کا عشر عشیر حق ادا نہ ہو سکے گا۔

در گوش دلم بخواند یک زمزمۂ عشق — زاں زمزمہ زپائی تا سر ہمہ عشق

حقا کہ بعہدہا نیایم بیروں — از عہدۂ حق گذاری یک دمہ عشق

ان سطروں سے ظاہر ہے کہ وہ راہ سلوک پر بھی گامزن رہے، شیخ داؤد جہنی وال کے ذکر کے سلسلہ میں ایک جگہ انھوں نے ان کے نام کے آگے غوث الانامی مرشدی ملاذی بھی لکھا ہے (ج ۲ ص ۳۹۴)، پھر تیسری جلد میں ان کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے بیعت بھی ہو گئے تھے، جہنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، شیخ داؤد کے آبا و اجداد عرب سے آکر وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے، شیخ داؤد کو حضرت غلام الثقلین سے ایک باطنی مناسبت ہو گئی تھی، اجب سلوک و ارشاد کی طرف مائل ہوئے تو بیس سال تک صحرا نوردی میں گذار دی، پھر شیر گڈھ میں آکر رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے، حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر ان کی خانقاہ میں ایک لاکھ آدمی جمع ہو جاتے اور وہ ان کی میزبانی کرتے، لیکن خود ان کے حجرے میں مٹی کے ایک پیالہ اور ایک بوریا کے سوا کچھ نہ ہوتا، ملا صاحب نے ان سے اپنے تعلقات

کا تذکرہ اس طرح کیا ہے،

"بیرم خاں کا عہد بہترین تھا، اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا، میں آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا، اس وقت میں نے ان (یعنی شیخ داؤد جہنی وال) کی عظمت وجلالت کا حال بعض درویشوں کی زبانی سنا تھا، ان کی عقیدت و محبت کا بیج میرے دل میں پڑ گیا تھا، اور غائبانہ طور پر ان سے ملنے کی ہوس پیدا ہوئی،

آری آری گوش پیش از چشم عاشق می شود

ان دنوں میں نے چند بار شیر گڈھ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے آستان ملایک مطاف کا طواف کرنے کا ارادہ کیا، لیکن کبھی والد مرحوم مغفور مانع ہوئے اور راستے سے لوٹا لیا، بعض اوقات کچھ اور موانع ہوئے کہ وہاں پہنچکر دولت حاصل کرنے سے محروم رہا، اس انتظار میں بارہ[12] سال گذر گئے، ان ایک مرید شیخ کالو میری غائبانہ عقیدت سے واقف تھا، ایک روز اس نے ہما کی طرح اپنا سایہ بدا ذن میں ڈالا، اور اس نے مجھ سے کہا کر کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ حضرت میاں زندہ ہیں اور تم وہاں تک پہنچکر ان کے دیدار سے ابتک محروم ہو، یہ بات میرے اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی، اس کے بعد حق تعالیٰ نے ایک اچھا سبب پیدا کر دیا، ان دنوں میں محمد حسین خاں کا ملازم تھا، وہ میرزا حسین کے تعاقب میں کانت گور (ضلع سہارنپور) سے پنجاب کی طرف گیا، تو مجھکو اس سعادت کے حاصل کرنے کا موقع مل گیا، میں لاہور سے شیر گڈھ پہنچا، میں نے ان جمال میں ایسی چیز پائی جو کسی اور صاحب حسن میں نہیں پائی جا سکتی تھی، وہ باتیں کرتے یا مسکراتے تو ان کے دانتوں سے نور برستا جس سے دل کی تاریکی

دور ہو جاتی اور وہ منور ہو جاتا ہے اور معرفت کا راز عیاں ہوتا نظر آتا، میں نے اپنی فانی زندگی کے تین چار دن وہاں گذارے، کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ سو سو اور پچاس پچاس ہندو اپنے خاندان کے ساتھ آکر مشرف با اسلام نہ ہوتے، اور ان کی تلقین نہ ہوتی، اس شہر کے در و دیوار، شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے ہوئے معلوم ہوتے انھوں نے مجھکو ایک کلاہ مبارک عنایت کی اور حکم دیا کہ میری طرف سے اپنے اہل و عیال میں تم نائب بن کر رہو، میرا بھی یہی طریقہ ہے، اور اپنی اہلیہ کی طرف سے میرے متعلقین اور لڑکوں کے لیے دوپٹہ اور رومال بھجوائے، میں نے عرض کیا کہ اگر ایک کرتہ بھی عطا ہو تو میرے لیے نور علی نور ہے، بڑے تامل کے بعد فرمایا کہ وہ بھی وقت پر مل جائے گا، میں نے ان سے اپنی پوشیدہ باتیں اور دلی مقاصد بیان کیے، اور ان کے جوابات سنے، میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی، اس اثنا میں وہ بھی کمزوری کی وجہ سے ایک محافہ میں بیٹھکر مسجد سے گھر کی طرف روانہ ہوئے، میں نے ان کے محافہ کے پایہ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا، اور چند قدم چلا، اس وقت مجھ پر بڑا گریہ طاری ہو گیا، وہ رک گئے اور محافہ سے اتر کر بیٹھ گئے، اور خدا تعالیٰ کی معرفت و محبت کی ایسی باتیں سنائیں کہ میرے دل کی کیفیت اور بھی تیز ہو گئی .... میں لاہور پہنچکر حسین خاں کے لشکریوں کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا، ایک روز میں سہارنپور میں ایک باغ میں بیٹھا تھا کہ میرا دل حضرت کی جدائی سے کباب ہو رہا تھا کہ ایک مسافر تاری پیرہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا، اور کہنے لگا یہ لو، یہ مجھکو ایک بڑے بزرگ سے ملا ہے، اور مجھکو راستہ کا خرچ دے دو، میں نے اس سے حقیقت حال

دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ "میرزا ابراہیم حسین کو شکست ہوئی، تو اس کے لشکریوں پر بھی مصیبت آئی، میں بھی ان لشکریوں میں تھا، یہ لشکری لٹ لٹا کر ننگے اور برہنہ شیر گڈھ حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عطا کیا، جب میری باری آئی تو یہ کرتہ اپنے بدن مبارک سے اتار کر مجھکو مرحمت کیا، میں نے اس کو پہننا بے ادبی جانا، اور اس کو تحفہ کے طور پر امانت رکھ چھوڑا تھا، اب میں تم کو دے رہا ہوں"۔ میں نے اس کو ہدیۂ غیبی تصور کیا، ایسا معلوم ہوا کہ ہوا نے ایک خزانہ لاکر دیدیا ہے، اور میں نے اس کو تبرک سمجھ کر لے لیا،

نکہت پیراہنت آمد بر من	لذتِ جاں یافتم زاں دا نجہ
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا	شد قبول الحمد للہ فاتحہ

مجھکو ان کی وہ بات یاد آگئی کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ پیراہن بھی وقت پر ملیگا، اس کو میں نے ان کی کرامت تصور کیا، اور اب اس پیراہنِ یوسف کو اپنی جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں۔ (ج ۳ ص ۷۸-۷۸)

ان تفصیلات کے معلوم ہونے کے بعد کیا عجب کہ ملا صاحب کے دل میں آتشِ عشقِ الٰہی بھی فروزاں رہتی ہو، اسی لیے اس زمانہ کے علماء و صلحاء بھی ان کی طرف مائل رہے، مثلاً ملا صاحب کے معاصر بزرگوں میں میاں کمال الدین حسین شیرازی اپنی عبادت، ریاضت ذکر الٰہی کے لیے مشہور تھے، ان سے ملا صاحب کے روابط چالیس برس تک رہے اور ان کو اعتراف ہے کہ وہ ان سے اپنی مہربانیوں کے ساتھ ملتے رہے کہ ان سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی، ان کے لیے یہ شعر لکھا ہے:

بس عشق کہ آں کم نہ شد ہیچ حسن کہ آں کاست	عشق من و حسن تو ہماں ملکہ فزوں ہم

میاں کمال الدین حسین شیرازی بھی ان سے بڑی محبت رکھتے اور ان کے خطوط کو بڑے شوق سے پڑھتے، وہ ملا صاحب کو لکھتے ہیں کہ آپ کے متعدد خطوط یکے بعد دیگرے پہنچے، خدا گواہ ہے کہ ان سے بڑی تسلی اور تسکین ہوئی، کئی روز تک ان خطوط کو برابر پڑھتا رہا، اور صبح و شام ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعائیں کیں۔

الٰہی تا قیامت زندہ باشی (ج ۳ ص ۱۲۸-۱۲۷)

بزم صوفیہ

(طبع ثانی)

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصانیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی، شیخ بوعلی قلندر، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید محمد گیسو دراز، حضرت شیخ احمد عبد الحق توشہ رودولوی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل ان کے ملفوظات و تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس اڈیشن میں، ان تمام بزرگوں کے حالات میں بکثرت اضافوں کے ساتھ، شیخ احمد عبد الحق توشہ رودولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کا مستقل اضافہ ہے۔ قیمت للعہ/۱۴

مزید افادہ کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تعلیمات و ملفوظات الگ رسالہ کی صورت میں بھی چھپ گئے ہیں۔ قیمت عہ

مصنفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"

کل مولود یولد علی الفطرۃ (الحدیث) کا مفہوم

(علامہ ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کا ایک ورق)

از ضیاء الدین اصلاحی

علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی (متوفی ۴۶۳ھ) نامور محدث و فقیہ اور جامع کمالات علمائے اسلام میں تھے، احادیث کی شرح و توجیہ میں وہ زیادہ ممتاز تھے، غالباً مالکیہ میں اس پایہ کا شارح حدیث نہیں گذرا ہے، اس حیثیت سے مالکیہ میں ان کو وہی درجہ اور مرتبہ حاصل ہے جو شافعیہ میں امام خطابی صاحب معالم السنن، حافظ نووی اور محی السنۃ بغوی کو اور حنفیہ میں امام ابو جعفر طحاوی کو حاصل ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:

(ابن عبدالبر از مالکیہ مقدم آں جماعت — مالکیہ میں اس جماعت (شارحین حدیث)
(عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص۶) — میں ان کو سب پر تقدم حاصل ہے

حافظ ابن عبدالبر کی مختلف فنون میں بلند پایہ کتابیں ہیں، ان کی زیادہ مایہ ناز اور اہم کتاب "تمہید" ہے، جو مؤطا امام مالکؒ کی ایک مبسوط اور ضخیم شرح ہے۔

انھوں نے موطا کی شرح میں استذکار، التقصی اور تجرید کے نام سے بھی کتابیں لکھی تھیں، ان کی اہمیت بھی مسلم ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے تمہید اور استذکار دونوں کو خاص اور یادگار تصنیف قرار دیا ہے، لیکن یہ سب شرحیں تمہید کا خلاصہ یا مقدمہ ہیں،

علامہ ابن حزمؒ کا بیان ہے:

"میں نے ایسی عمدہ اور بے نظیر شرح نہیں دیکھی، اس میں حدیث و فقہ کے مباحث پر جس طرح بحث و کلام کیا گیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی، اس سے عمدہ اور بہتر کا کیا سوال؟" (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱)

علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں:-

ابن عبدالبر سے پہلے کسی نے ایسی عمدہ اور عظیم الشان کتاب نہیں لکھی" (تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸)

شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ کتاب فقہ حدیث میں نادرۂ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے"

(بستان المحدثین ص ۶۹)

مولانا محمد سورتی مرحوم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ شروح حدیث میں ابن عبدالبر کی قابل قدر اور بہترین کتاب ہے جس کی نظیر اب تک کوئی شرح نہیں دیکھی گئی، ابن حزم نے اس کتاب کی بےحد تعریف کی ہے، اور یہ اس کا استحقاق بھی رکھتی ہے...... یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے اس کا انتخاب ازبس ضروری کا ہے" (معارف فروری ۱۹۳۲ء)

افسوس ہے کہ یہ عظیم الشان اور گرانمایہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے، یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا مکمل نسخہ کہیں موجود ہے یا نہیں؟ حجاز، مصر اور ہندوستان کے بعض کتبخانوں میں جو قلمی نسخے ہیں وہ غالباً ناقص ہیں۔

۱۳۵۰ھ میں ان کی تصنیف "تجرید" قاہرہ سے شائع ہوئی تو اس کے آخر میں مصری نسخے سے "تمہید" کے چند صفحے بھی شامل کر دیے گئے جو مؤطا کی بعض حدیثوں کی شرح و توجیہ پر مشتمل ہیں، ان ہی متفرق صفحات میں مشہور حدیث "کل مولود یولد علی الفطرۃ" کی مفصل

شرح و توجیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے آخر میں ان تمام حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو صغر سنی میں مرنے والے بچوں کے متعلق وارد ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر نے اس بحث میں اپنی جو رائے ظاہر کی ہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر ان کی بحث بڑی جامع اور پر مغز ہونے کے علاوہ بعض حیثیتوں سے نہایت اہم اور منفرد نوعیت کی ہے، اس حدیث پر ایسی بسیط بحث اور کہیں نہیں ملتی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے حوالے دیے ہیں، علامہ ابن قیمؒ نے قضا و قدر کے مسائل پر شفاء العلیل کے نام سے ایک بڑی اہم اور عمدہ کتاب لکھی ہے، اس کے آخر میں اس حدیث پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے، لیکن اولاً تو اس کا موضوع ہی دوسرا ہے اور مصنف کا اصل مقصد قدریہ وغیرہ منکرین تقدیر کا رد و ابطال ہے، دوسرے علامہ ابن عبدالبر کی بحث و تشریح اس سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے، اسی بنا پر علامہ ابن قیم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ اس مضمون میں اسی پر از معلومات شرح کا ملخص درج کیا جاتا ہے، اور حواشی میں بعض ضروری باتوں کا اضافہ اور حوالوں وغیرہ کی تخریج کر دی گئی ہے۔

امام مالکؒ نے اس حدیث کی تخریج اس طرح کی ہے۔

مالك عن ابی الزناد عن الاعرج	امام مالکؒ ابو الزناد سے وہ اعرج سے
عن ابی هریرۃ ان رسول اللہ	اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے
صلی اللہ علیہ وسلم قال کل مولود	ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
یولد علی الفطرۃ فابواہ یهودانه	کہ "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے
او ینصرانه کما تناتج الابل	والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں،
من بهیمۃ جمعاء هل تحس من جدعاء	جس طرح کہ اونٹنی کے پیٹ سے کامل الخلقت

قالوا یا رسول اللہ ارأیت	اور سالم جانور پیدا ہوتا ہے، کیا تم اس میں
الذی یموت وھو صغیر قال	کوئی ایسا جانور دیکھتے ہو جس کے ناک یا کان
اعلم بما کانوا عاملین" [1]	کٹے ہوئے (ناقص الاعضاء) ہوں صحابہ
	نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ اسکے
	متعلق کیا فرماتے ہیں جو بچپن ہی میں فوت
	ہو جاتا ہے، آپنے فرمایا، اللہ زیادہ جانتا ہے
	اس کو جو وہ کرنے والے تھے۔

یہ حدیث جس کو حضرت ابو ہریرہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ نے بھی روایت کیا ہے [2]، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحیح و ثابت طرق سے مروی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے اس کی روایت کرنے والے اصحاب کے نام یہ ہیں:

عبدالرحمٰن اعرجؒ، سعید بن مسیبؒ، ابو سلمہؒ، حمیدؒ (یہ دونوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحبزادے ہیں)، ابو صالح سمانؒ، سعید بن ابی سعیدؒ، محمد بن سیرینؒ [3]۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجنائز ص ۸۵ بعینہ اسی سند سے امام ابو داؤد نے بھی اس حدیث کی اپنی سنن میں تخریج کی ہے، انکے اور امام مالک کے درمیان صرف ایک راوی قعنبی کا واسطہ ہے لیکن انکے یہاں ارأیت الذی یموت کی جگہ افرأیت من یموت ہے (ج ۲ ص ۲۹۲ باب فی ذراری المشرکین [2] غالباً صحاح میں یہ صرف حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے، البتہ امام احمد نے انکے علاوہ حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت اسود بن سریعؓ سے بھی اسکی روایت کی ہے، (ملاحظہ ہو مسند احمد ج ۳ ص ۳۵۳ و ۳۵ ج ۴ ص ۲۴) [3] حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن ابی سعید اور محمد بن سیرین کے علاوہ سب کی حدیثیں صحاح، مسند احمد و مسند طیالسی میں مذکور ہیں، حمید کی روایت کی تخریج ابن عبدالبر نے یہیں کی ہے اور سعید و محمد کی روایات آگے نقل کی ہیں، اس فہرست میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرنے والے چند لوگوں کے نام رہ گئے ہیں جو یہ ہیں: ہمام بن منبہؒ، عبدالرحمٰن بن یعقوب حرقیؒ، طاؤسؒ اور ذکوانؒ، ہمام کی روایت صحیحین اور مسند احمد میں عبدالرحمٰن حرقی کی صرف صحیح مسلم میں اور طاؤس و ذکوان کی صرف مسند احمد میں ہے۔

ابن شہاب[1] نے بھی اس کی روایت کی ہے، لیکن ان کے تلامذہ کا اسناد میں اختلاف ہے، چنانچہ معمر اور زبیدی نے زہری سے جو روایت کی ہے اس کو ان سے سعید بن مسیب نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے، اور یونس بن ابی ذئب کی زہری سے جو روایت ہے اس کو ان سے ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے[2]، امام اوزاعی نے امام زہری سے جو حدیث بیان کی ہے اس کو ان سے حمید بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے،

محمد بن یحییٰ ذہلی نے ان سب طرق کو صحیح اور محفوظ قرار دیا ہے، لیکن امام مالکؒ نے ابن شہاب زہری کے بجائے یہ حدیث ابوالزناد کے واسطہ سے مؤطا میں درج کی ہے، ان کے شیخ عبداللہ بن فضل ہاشمی نے امام مالک کی مذکورۂ بالا سند ہی سے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے،

کل مولود یولد علی الفطرۃ	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے بعد ازاں
فابواہ یھودانہ و ینصرانہ	اسکے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی
و یمجسانہ کالبھیمۃ تنتج البھیمۃ	اور مجوسی بنا دیتے ہیں جانور کی طرح
ھل تحس فیھا من جدعاء	جو (سالم اور تام الاعضاء) جانور

[1] یعنی محمد بن مسلم زہری جو نامور تابعی عالم ہیں، انھوں نے اگرچہ بعض صحابہ سے روایتیں کی ہیں لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے ان کے روایت کرنے کی صراحت نہیں ملتی، حافظ ابن حجرؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے انکے ارسال کی تصریح کی ہے (تہذیب ج ۹ ص ۴۴۸) یہ حدیث بھی جیسا کہ آگے متن کی تفصیل سے ظاہر ہے، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے براہ راست نہیں بیان کیا ہے بلکہ بالواسطہ [2] معمر بن راشد ازدی اور محمد بن ولید بن عامر زبیدی کی حدیثیں صحیح مسلم اور مسند احمد میں اور ابن ابی ذئب کی صحیحین، مسند احمد اور مسند طیالسی میں ہیں

حتی یکونوا ھم یجدعونھا	جنتا ہے، کیا تم کو اس میں کوئی ناک یا کان کٹا (ناقص الاعضاء) جانور نظر آتا ہے یہاں تک کہ لوگ خود ہی اسکے ناک اور کان

اس میں صحابہ کے سوال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا جو امام مالکؒ کی روایت کے آخر میں ہے، ذکر نہیں ہے، اور یمجسانہ کا اضافہ ہے جو امام مالکؒ کی روایت میں نہیں ہے، ابن شہاب کی روایتوں میں بھی یہ سوال و جواب مذکور نہیں ہے، لیکن انھوں نے عطاء بن یزید کے واسطہ سے اس حدیث کی جو روایت کی ہے، اس میں سوال و جواب کا اس طرح ذکر ہے:-

انہ سئل عن اولاد المشرکین	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین
فقال اللہ اعلم بما کانوا عاملین[1]	کی اولاد کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتا ہے اسکو جو وہ کرنے

اس حدیث کے مفہوم میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک جماعت کے نزدیک یہاں "کل" کے لفظ میں عموم نہیں ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ بچہ جو فطرت پر غیر مسلم والدین کے یہاں پیدا ہوتا ہے، اس کو اس کے والدین یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ بنی آدم کے تمام بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں، بلکہ صرف کافر والدین کے یہاں جو بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں ان کو وہ کافر بنا دیتے ہیں، درحقیقت بچوں کا حکم انکے

[1] جن بزرگوں سے یہ حدیث مروی ہے ان سب کے یہاں الفاظ وغیرہ کا معمولی فرق ہے، علامہ ابن عبدالبر نے گو تمام روایات کا استقصاء نہیں کیا ہے، تاہم آگے کچھ حدیثیں نقل کی ہیں، ان سے اس فرق و اختلاف کا پتہ چلتا ہے۔

والدین کے مطابق ہوتا ہے، اگر وہ مسلمان ہیں تو بچوں کا حکم بھی مسلمانوں جیسا ہوگا، اور اگر وہ یہودی ہیں تو بچہ بھی یہودی سمجھا جائے گا، اور اسی اعتبار سے وہ اپنے والدین کا وارث ہوگا، اسی طرح اگر والدین نصرانی یا مجوسی ہیں تو بچے کا حال بھی ان ہی جیسا ہوگا، تا آنکہ وہ سن رشد وتمیز کو پہنچ کر اپنے متعلق خود کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے، کیونکہ جب وہ اپنی عمر کے اس مرحلہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو خود ذمہ دار سمجھا جائے گا، اور اس وقت اس کے ساتھ وہ حکم اور معاملہ کیا جائیگا، جو وہ خود اپنے لیے پسند اور تجویز کرے گا، اور بچپن میں والدین کی رعایت اور اعتبار سے جو معاملہ اس کے ساتھ کیا جاتا تھا، وہ اب نہیں کیا جائے گا۔

ان لوگوں نے اپنے مفہوم کی تائید میں حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے:

ان الغلام الذی قتلہ الخضر	بیشک اس غلام کو جسے حضرت خضرؑ نے
طبعہ اللہ یوم طبعہ کافراً[1]	قتل کیا اس کو خدا نے اس کی پیدائش
	ہی کے روز کافر بنایا تھا۔

ان لوگوں کا دوسرا استدلال اس روایت سے ہے:-

الا ان بنی آدم خلقوا طبقات	بنی آدم کو مختلف حالتوں میں پیدا کیا گیا ہے
فمنھم من یولد مومنا ویحیا	ان میں سے بعض لوگ مومن پیدا ہوتے ہیں
مومنا ویموت مومنا ومنھم	اور مومن ہی جیتے اور مرتے ہیں، اور بعض
من یولد کافرا ویحیی کافراد	لوگ کافر پیدا ہو کر کافر ہی زندہ رہتے

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں الفاظ کے فرق کے ساتھ ملتی ہے، صحیح مسلم (کتاب القدر ج ۲ ص ۳۱۴) اور سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۲۹۱) کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں، صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں (ان الغلام الذی قتلہ الخضر طبع کافرا ولو عاش لارھق ابویہ طغیانا وکفرا)

یموت کافرا ومنھم من یولد	اور مرتے ہیں بعض لوگ پیدا تو مومن ہوتے
مومنا ویحیا مومنا ویموت کافرا	ہیں اور مومن ہی ہو کر زندہ بھی رہتے ہیں
ومنھم من یولد کافرا ویحیا کافرا	لیکن کافر ہو کر مرتے ہیں، اور بعض لوگ
ویموت مومنا[1]	کافر پیدا ہوتے اور زندہ رہتے ہیں، مگر
	مومن ہو کر مرتے ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے ارشاد مبارک "کل مولود یولد الخ" میں عموم نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین یہودی یا نصرانی ہوتے ہیں، اس کو اس کے والدین یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، لیکن یہ صورت سن بلوغ سے پہلے کی ہے، سن بلوغ کے بعد تو وہ خود اپنے لیے جس راہ عمل کو چاہیگا اسے اختیار کریگا۔

عام محدثین کے الفاظ قریب قریب امام مالک کی حدیث کے مطابق ہیں، جن لوگوں نے کل بنی آدم الخ کے الفاظ کی روایت کی ہے وہ اولاً تو ثابت اور مسلم نہیں ہیں، ثانیاً اگر انکا ثابت ہونا مسلم بھی ہو جائے تو اس سے اس مفہوم پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، کیونکہ "کل" کا خصوص کے لیے آنا کلام عرب میں روا ہے، قرآن مجید میں ہے:

تدمر کل شیء بامر ربھا (احقاف ۲۵)	وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے اکھاڑ پھینکے گی۔

یہاں ہوا کے ہر چیز کو اکھیڑ دینے کا ذکر ہے، مگر یہ مطلق نہیں ہے، کیونکہ اس نے آسمان اور زمین کو نہیں اکھاڑ پھینکا تھا، دوسری جگہ ہے:

فتحنا علیھم ابواب کل شیء (انعام ۴۴)	ہم نے کھول دیے ان پر ہر چیز کے دروازے

[1] یہ ایک طویل حدیث کا جو حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے، ٹکڑا ہے، امام احمد نے مسند ابی سعید میں دو جگہ اس کی تخریج کی ہے (ج ۳ ص ۱۹ و ۶۱)

یہاں بھی موقع کلام سے ظاہر ہے کہ خدا نے ان پر اپنی رحمت کے دروازے وا نہیں کیے تھے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ اس حدیث کے الفاظ تقریباً وہی ہیں جو امام مالکؒ کے ہیں، چنانچہ امام اوزاعیؒ کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

اسی قسم کے الفاظ معمر کی حدیث کے بھی ہیں، ملاحظہ ہو،

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البہیمۃ جمعاء ہل تحسون من جدعاء ثم یقول ابوہریرۃ اقرؤا ان شئتم (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا)

یہ حدیث عبدالرزاق سے بھی مروی ہے اور جہاں تک ہم کو علم ہے، ان کا معمر سے ان الفاظ (کل مولود الخ) میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان الفاظ کے متعلق ابن ابی ذئب کی روایت کا بھی یہی حال ہے، البتہ اس میں حضرت ابوہریرۃؓ کا قول (اقرؤا ان شئتم) مذکور نہیں ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "کل" کے لفظ میں عموم ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام بچے فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود سن رشد و بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ان کے معاملہ میں ان کے والدین کا اعتبار کیا جائے گا، اور ان ہی کے مطابق ان پر احکام بھی لگائے جائیں گے، البتہ سن رشد و تمیز کے بعد وہ خود مختار ہوں گے اور اپنے متعلق فیصلے کریں گے۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اس نوعیت کے کلام کا حق و اقتضا یہی ہے کہ اس کو عموم پر محمول کیا جائے، علاوہ ازیں کئی حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں، جن سے اس کو خصوص پر محمول کرنے کی گنجایش ہی نہیں رہتی، مثلاً عبدالرحمن بن ہرمز سے جعفر بن ربیعہ

نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرۃؓ نے فرمایا کہ:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود[1] یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ کما تنتج الابل من بہیمۃ جمعاء ہل تحس من جدعاء قال افرأیت من یموت صغیرا یا رسول اللہ قال اللہ اعلم بما کانوا عاملین۔

ابوالزناد نے اعرج سے اور وہ ابوہریرۃؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل بنی آدم یولد علی الفطرۃ الخ

ابن وہب نے یونس بن یزید سے، وہ ابن شہاب سے، وہ ابوسلمہ سے اور وہ حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:-

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ ثم قرء "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ"

عبداللہ بن صالح یونس سے، وہ ابن شہاب سے، روایت کرتے ہیں کہ انکو ابوسلمہ ابن عبدالرحمن نے بتایا کہ حضرت ابوہریرۃؓ نے فرمایا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کما تنتج البہیمۃ جمعاء ہل تحسون فیہا من جدعاء ثم قال ابوہریرۃ اقرؤا (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم)

سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں جو حدیث رؤیا کے نام سے مشہور ہے، مروی ہے کہ

---

[1] جعفر بن ربیعہ کی حدیث میں "کل مولود الخ" کے بجائے "کل بنی آدم" کا لفظ آیا ہے، یہ نقل و کتابت کی غلطی ہے ورنہ یہاں اس کا نقل کرنا ہی بے موقع ہے، آگے اس کی مزید توضیح کی جائے گی۔

واذا الشیخ الذی فی اصل الشجرۃ	اور جس ضعیف اور بوڑھے شخص کو تم نے
ابراھیم والولدان حولہ اولاد	درخت کی جڑ میں دیکھا وہ حضرت ابراہیمؑ
الناس[1]	تھے اور ان کے اردگرد لوگوں کے بچے تھے۔

ان حدیثوں کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی حدیث اور اسکے ہم معنی حدیثوں کی وہ تاویل درست نہیں ہو سکتی جو فریق اول نے بیان کی ہے کہ والدین صرف اپنے فطرت پر پیدا ہونے والے بچوں ہی کو یہودی اور نصرانی وغیرہ بناتے ہیں، کیونکہ بچے تو سبکے سب فطرت ہی پر پیدا ہوتے ہیں[2]۔

امام ابو حنیفہؒ کے نامور شاگرد اور مشہور فقیہ امام محمد بن حسنؒ شیبانی سے ابو عبید نے اس حدیث کا مفہوم دریافت کیا تو انھوں نے اس سے زیادہ کچھ جواب نہیں دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جہاد کا حکم دیے جانے سے پہلے یہ فرمایا تھا، ابو عبید کا بیان ہے کہ عبد اللہ ابن مبارک نے فرمایا کہ اس کی تفسیر حدیث کے آخری حصہ میں "اللہ اعلم بما کانوا عاملین" کہکر کی گئی ہے[3]۔ اس سلسلہ میں تقریباً امام مالکؒ کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ دلیل کافی واضح نہیں ہے۔ اس سے تو محض یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کے باب میں توقف کرنا چاہیے، اور جب تک وہ عاقل و بالغ نہ ہو جائیں، ان کے کفر و ایمان کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنے سے

---

[1] یہ بخاری کی طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو کتاب الجنائز میں ہے لیکن اس میں والولدان کے بجائے والصبیان کا لفظ ہے اس میں استدلال کا پہلو یہ ہے کہ چونکہ تمام بچے فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے وہ بچپن میں مرجانے کی صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس جنت میں ہوں گے [2] حافظ ابن حجرؒ نے اسی مفہوم کو مرجح قرار دیا ہے (فتح الباری ج ۳ ص ۱۹۵)

[3] امام خطابی اور علامہ نوویؒ نے ابن مبارکؒ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک بچہ سعادت و شقاوت پر پیدا کیا جاتا ہے۔

گریز کرنا چاہیے۔

امام محمدؒ کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ یا تو انھوں نے مسئلہ کی نزاکت اور اشکال کی بنا پر جواب دینے سے گریز کیا ہے، یا ان کو اس سے واقفیت ہی نہ رہی ہو یا پھر یہ وجہ رہی ہو کہ وہ اس طرح کے مسئلہ میں غور و خوض کو ناپسند کرتے اور خلاف احتیاط سمجھتے رہے ہوں، ان میں سے جو وجہ بھی رہی ہو لیکن درحقیقت ان کا یہ کہنا خلاف واقعہ ہے[1] کہ رسول اللہ صلعم نے جہاد کے

---

[1] نووی اور ابن حجر نے امام محمدؒ کے قول کی ابو عبید ہی کے حوالے سے وضاحت کی ہے کہ اگر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا تو بچپن ہی میں مرجانے کے بعد اس کے والدین اس کے وارث نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس کے وارث ہوتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات احکام کے باقاعدہ نازل ہونے اور فرض کیے جانے سے پہلے آپ نے فرمائی تھی، اور احکام کی فرضیت کے بعد یہ صورت تبدیل ہو گئی، اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بچے اپنے آباء کے دین پر پیدا ہوتے ہیں، ورنہ وارث ہونے کے کیا معنی ہوں گے (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۰۸ و فتح الباری ج ۳ ص ۱۹۵)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے قول کا مقصد یہ ہے کہ شریعت میں یہ طے ہے کہ یہودی و نصرانی کے بچے دنیا کے احکام میں اپنے والدین کے دین کے تابع ہیں، اس لیے ان کے بارہ میں کفر کا حکم لگایا جائے گا اور انکے جنازہ کی نماز وغیرہ نہیں پڑھی جائے گی اور نہ مسلمان ان کے وارث ہو سکیں گے، تا آنکہ وہ سن رشد و بلوغ کو نہ پہنچ جائیں، اور یہ بالکل حق ہے، لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اس حدیث کا اقتضا یہ ہے کہ بچوں کے لیے دنیا میں مسلمانوں کے احکام ہوں گے، اس لیے انھوں نے فرمایا کہ یہ منسوخ اور جہاد کے حکم سے پہلے کی حدیث ہے، کیونکہ جہاد کا حکم آجانے کے بعد بچوں کا استرقاق مباح ہو گیا، جب کہ مسلمان کا استرقاق نہیں ہوتا۔ حالانکہ بچے کا دنیوی احکام میں اپنے والدین کے دین کا تابع ہونا ایک ایسا امر شرعی ہے جو دائمی ہے، رہی یہ حدیث تو اس کا مقصد انکے متعلق اس طرح کے احکام بیان کرنے کے بجائے اس فطرت کا بیان ہے جس پر بچے پیدا کیے جاتے ہیں۔ (شفاء العلیل ص ۲۸۸)

حکم سے پہلے یہ فرمایا تھا، کیونکہ اسود بن سریع کی درج ذیل روایت سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے جہاد کا حکم دیے جانے کے بعد یہ فرمایا تھا۔

مابال قوم بلغوا فی القتل حتی — جو لوگ قتل و خونریزی میں اسقدر تجاوز

قتلوا الولدان فقال رجل اولیس — کرجائیں کہ بچوں تک کو قتل کر ڈالیں،

انما ھم اولاد المشرکین انہ — ان کا انجام کیا ہوگا، ایک شخص نے کہا کہ

لیس من مولود الا وھو یولد — کیا یہ مشرکین کے بچے نہیں تھے، آپ نے فرمایا

علی الفطرۃ [1] — کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا

یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہے، اور سمرہ بن جندبؓ سے ابو رجا عطاردی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [کل مولود یولد علی الفطرۃ فناداہ الناس یا رسول اللہ واولاد المشرکین قال واولاد الناس [2])

---

[1] امام احمدؒ نے مسند میں کئی جگہ اس کی تخریج کی ہے (ج ۳ ص ۴۳۵ و جلد ۴ ص ۲۴) لیکن الفاظ قدرے مختلف ہیں بعض حدیثوں میں تصریح ہو کہ یہ بات آپ نے غزوۂ حنین کے موقع پر فرمائی تھی، ایسی صورت میں ابن عبدالبر کے نقد کی قوت مزید ثابت ہوتی ہے۔

[2] یہ حدیث بھی اسی موقع اور سلسلہ کی ہے، دوسرے اس کے راوی سمرہ بن جندبؓ ہیں جو اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ہمراہ جب مدینہ تشریف لائے تو اس قدر کمسن تھے کہ ایک غزوہ میں شرکت کے لیے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا، تو آپ نے ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہیں کیا، گو اس کے بعد وہ دوسرے غزوات میں شریک ہوئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی روایت جہاد کا حکم آجانے کے بعد ہی کی ہوسکتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے وہ روایت کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔

لفظ فطرت کے مفہوم میں علماء کا شدید اختلاف ہے، اب ہم علماء کے اختلافات اور ان کے دلائل کی تفصیل نقل کرتے ہیں:۔

اہل فقہ و نظر کی ایک جماعت کے نزدیک فطرت سے خلقت مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بچہ کی خلقت کے اندر اللہ کی معرفت کی صلاحیت و استعداد ودیعت کی گئی ہے؛ گویا آپ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ چونکہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس لیے جب وہ سن رشد کو پہنچ جائے گا اور اس کے اندر علم و معرفت کی استعداد پیدا ہو جائے گی تو وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ نے اس کی خلقت ان بہائم سے مختلف بنائی ہے جن کی معرفت ربانی تک رسائی ہی نہیں ہوسکتی، فطرت کے خلقت اور فاطر کے خالق کے معنی میں ہونے کی دلیل ان آیات سے ملتی ہے۔

الحمد للہ فاطر السموات والارض — سارا شکر اللہ کو ہے جس نے بنا نکالے

(فاطر - ۱) — آسمانوں اور زمین کو

یہاں آسمانوں اور زمین کے فاطر سے ان کا خالق مراد ہے، دوسری آیت میں ہے:

ومالی لا اعبد الذی فطرنی — اور مجھکو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں

(یس - ۲۲) — اس کی جس نے مجھکو پیدا کیا۔

اس میں "فطرنی" خلقنی کے معنی میں ہے، اس قسم کی آیتیں اور بھی ہیں،

ان لوگوں نے بچوں کے کفر و انکار یا معرفت و ایمان پر پیدا کیے جانے کی تردید کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ ان کی خلقت اور بناوٹ صحت و سلامتی پر کی گئی ہے، کسی شخص کو طبعی اور پیدائشی طور پر ایمان و کفر یا معرفت و

انکار سے کوئی اضافت اور نسبت نہیں ہوتی، البتہ جب سن بلوغ و تمیز کو پہنچ جاتا ہے تب اس کے اندر کفر و ایمان کا عقیدہ اور معرفت و انکار سے تعلق پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ خود اسی حدیث میں کہا گیا ہے کہ [کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء یعنی سالمۃ ھل تحسون فیھا من جدعاء یعنی مقطوعۃ الاذن] یعنی بچہ اسی طرح صحیح و سالم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، جس طرح کہ جانور سالم اور بلا کان کٹا ہوا پیدا ہوتا ہے، پس اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی آدم کے قلوب کو بہائم کے مماثل و مشابہ قرار دیا ہے، کیونکہ وہ کامل الخلقت، بلا عیب اور ہر نقص و کمی سے پاک پیدا ہوتے ہیں، لیکن جب لوگ ان کے ناک اور کان کاٹ دیتے ہیں تو وہ بحائر و سوائب وغیرہ کہلاتے ہیں، انسان کی پیدائش کے وقت اس کے قلب کا حال بھی ان ہی صحیح و سالم پیدا ہونے والے چوپایوں کی طرح ہوتا ہے، وہ کفر و ایمان اور انکار و معرفت وغیرہ کی نسبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں لیکن سنِ بلوغ کے بعد ان پر شیاطین حاوی اور غالب ہو جاتے ہیں، اس لیے اکثر لوگ تو کفر و انکار کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور کم لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، ورنہ اگر ابتدا ہی میں بچے کفر و ایمان پر پیدا کیے جاتے تو وہ اپنی اس اولین حالت کو چھوڑ کر کسی اور حالت میں کبھی منتقل نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ اس کے بالکل برعکس ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ ایمان کے بعد کفر اور کفر کے بعد ایمان کو اختیار کرتے رہتے ہیں، اس لیے پیدائش کے وقت بچوں میں کفر و ایمان کی فہم و تمیز یا معرفت و انکار کا شعور و ادراک ہونا بالکل عقلاً محال ہے، کیونکہ اس وقت تو وہ اللہ کی طرف سے ایک ایسے حال میں ہوتے ہیں جس میں نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں اور نہ کوئی بات ہی جان سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:-

واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم   اور اللہ نے تم لوگوں کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے

لا تعلمون شیئا (نحل - ۷۸)   اس حال میں نکالا کہ تم کسی چیز کو جانتے نہیں تھے،

اور جب وہ اس وقت کچھ جانتے ہی نہیں تو ان کو کفر و ایمان کی تمیز یا معرفت و انکار کا شعور کس طرح ہو جائے گا۔[1]

ہمارے نزدیک حدیث میں لوگوں کے جس فطرت پر پیدا کیے جانے کا ذکر ہے، اس کی تاویل کے سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح و صائب مفہوم یہی ہے[2]، اس کی تفصیل یہ ہے کہ فطرت

---

[1] علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ "حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بچہ پیدائش کے وقت ہی دین کو جانتا اور سمجھتا ہے کیونکہ اللہ نے تو خود فرمایا ہے (واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم الخ) بلکہ یہ مراد ہے کہ اسکی فطرت دین اسلام کی معرفت و محبت کی مقتضی ہوتی ہے، پس نفس فطرت دین کے اقرار و محبت کو مستلزم ہے نہ کہ قبولیت دین کو، کیونکہ اگر یہ ہوتا تو والدین کے یہودی و نصرانی بنانے سے اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، اور نہ ان کی تلقین و ترغیب فطرت کی قبولیت دین کے لیے مانع بن سکتی تھی، پس حدیث کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہوگا کہ ہر بچہ اقرار ربوبیت کے اقتضاء پر پیدا کیا جاتا ہے اس لیے اگر وہ اسی حال پر چھوڑ دیا گیا اور اس کے مخالف عوارض سے اس کا سابقہ نہ ہوا تو وہ اس سے منحرف نہیں ہوگا، جس طرح کہ بچہ کے اندر اپنے جسم و بدن کے لائق غذا یعنی دودھ سے فطرۃً رغبت و محبت ہوتی ہے، اور جب تک اس سے اسکو منحرف کرنے والی کوئی اور خاص چیز نہ ہو وہ دودھ سے بیزار نہیں ہوتا، اسی لیے حدیث میں فطرت کو لبن (دودھ) کے مشابہ بتایا گیا ہے (شفاء العلیل ص ۲۸۹)

[2] امام نووی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اسی مفہوم کو ترجیح دیا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں: "اس حدیث کا سب سے زیادہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ فطرت سلیم دین حق کا سبب و وسیلہ ہے، بچہ اس سلیم طبیعت اور جبلت پر پیدا ہوتا ہے جس میں دین حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد ہوتی ہے، پس اگر بچہ کو اسی حال پہ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس پہ قائم رہے گا اور اس کو ترک کر کے کوئی اور راہ اختیار نہیں کریگا جو لوگ اس فطری راہ عمل کو چھوڑ دیتے ہیں وہ دراصل ماحول کے بگاڑ، نشو و نما کی خرابی اور تقلید وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے، اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بچہ کے اندر

(باقی حاشیہ ص ۲۰۴ پر)

دراصل سلامت و استقامت کا نام ہے، جیسا کہ عیاض بن حماد نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

انی خلقت عبادی حنفاء[1]	بیشک میں نے اپنے بندوں کو حنیف
(یعنی علی استقامۃ وسلامۃ)	یعنی استقامت اور سلامتی پر پیدا کیا ہے،

کلام عرب میں حنیف مستقیم و سالم کے معنی میں آتا ہے، اعرج (لنگڑا) کو بطور شگون احنف کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا منشا یہ بتانا ہے کہ لوگ پیدائش کے وقت تمام آفات و عوارض سے پاک اور معاصی وطاعات کے کاموں سے خالی ہوتے ہیں، اس لیے اس وقت نہ ان سے کسی معصیت کا ظہور ہوتا ہے اور نہ طاعت کا، کیونکہ اس وقت تو ان کو اس کا کوئی علم و شعور ہی نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس غلام کے بارہ میں جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا، یہ فرمایا کہ

أقتلت نفساً زكيةً بغير	کیا تونے ایک ستھری جان کو بغیر کسی
نفس (کہف)	جان کے عوض مار ڈالا۔

کیونکہ یہ ابھی عمر کے اس مرحلہ میں داخل نہیں ہوا تھا جس میں عمل کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اس کی تائید مندرجہ ذیل آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۳) لازمی طور پر ایمان موجود رہتا ہے، اور نہ یہی یہ پتہ چلتا ہے کہ دین حق کو قبول کرنے کے لیے فطرت کوئی واقعی علت ہے، اس حدیث کی غرض وغایت دین کی تعریف اور یہ بتانا ہے کہ طبائع میں فی الواقع اس کی جگہ ہوتی ہے اور نفوس اس کو واقعۃً پسند کرتے ہیں۔ (مصنفہ ج ۲ ص ۲۴۲) نووی نے بھی قریب قریب یہی بات لکھی ہے۔

[1] رواہ مسلم فی صحیحہ

انما تجزون ما کنتم تعملون	تم کو وہی بدلہ دیا جائے گا جو کرتے
(تحریم - ۷)	تھے۔

دوسری جگہ ہے :-

کل نفس بما کسبت رھینۃ	ہر ایک جی اپنے کیے کاموں میں
(مدثر - ۳۸)	پھنسا ہوا ہے۔

غور کرو ایک بچہ جس سے نہ کوئی عمل سرزد ہوا اور نہ جس کے اندر ابھی اس کی استعداد ہی ہے، وہ کسی چیز کا مکلف اور ذمہ دار کیسے ہو جائیگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وما کنا معذبین حتی نبعث	اور ہم بلا نہیں ڈالتے جب تک
رسولا (بنی اسرائیل - ۱۵)	نہ بھیجیں کوئی رسول۔

اور جب دنیوی زندگی میں بچوں پر حدود، قصاص اور عقوبات کے جاری نہ کیے جانے پر علماء کا اتفاق ہے، تو آخرت میں تو وہ اس کے بدرجۂ اولیٰ مستحق ہوں گے۔

اب آپ کے ارشاد [کما تنتج الابل من بھیمۃ جمعاء ھل تحس من جدعاء] پر غور کرو تو ہمارا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے گا، "البھیمۃ الجمعاء" سے وہ جامع خلقت اور سالم جسم والا جانور مراد ہے جو بالکل بے عیب اور ہر لحاظ سے کامل و سالم ہو، جدع کے معنی نقصان کے ہیں، یعنی جس وقت جانور پیدا ہوتا ہے، وہ بالکل صحیح و سالم ہوتا ہے، تم کو اس کے اندر کوئی نقص اور عیب نظر نہیں آسکتا، عیوب و نقائص تو بعد میں پیدا ہو جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بچہ کا بھی ہے کہ وہ بالکل سالم ہوتا ہے، کفر و ایمان کے عوارض بعد میں اس پر طاری ہوتے ہیں۔

(باقی)

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت

از جناب ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب لکچرار عربی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی

اس مضمون کی پہلی قسطیں جو "ہندوستان کے عربی شعراء" پر تھیں، بہت پہلے شائع ہو چکی تھیں، آخری قسط اب شائع ہو رہی ہے۔ ہر زبان کی شاعری اپنے گرد و پیش کے حالات کا آئینہ ہوتی ہے، جس میں اس کے ماحول اور اس دور کے خیالات و رجحانات اور تہذیب و تمدن کا عکس نظر آتا ہے، اس لیے ایک ہی زبان کی شاعری کا رنگ مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے، اور دوسرے ملکوں میں جا کر تو اور بھی بدل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے فارسی شعراء ایرانی شعراء کے ٹکر کے تھے، اس کے باوجود ان کے طرز نے سبک ہندی کا نام پایا، عربی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، وہ بھی عرب سے نکلنے کے بعد دوسرے ملکوں کے اثرات سے متاثر ہوئی، بلکہ عباسی دور ہی میں جب عربوں کی حکومت تھی، حکومت کی زبان عربی تھی، عراق، عرب سے بالکل متصل تھا، عربی شاعری بہت بدل گئی تھی، اور اس میں عجمی اثرات اتنے غالب ہو گئے تھے کہ بعض شعراء فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں تک استعمال کرنے لگے تھے، اور عرب جاہلی کی شاعری پر تنقیدیں کرتے تھے، اس لیے ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت حالات کا قدرتی نتیجہ ہے جس کا اعتراف خود مضمون نگار نے بھی کیا ہے، اور مضمون کا عنوان "ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت" رکھا ہے، انھوں نے انکے کلام میں جس قسم کی خامیاں دکھائی ہیں ان سے عرب شعرا کا کلام بھی خالی نہیں ہے، اس سے

ان کے کمال میں فرق نہیں آتا، اور آزاد بلگرامی، قاضی عبد المقتدر، شاہ ولی اللہ کا کلام کسی عربی شاعر کے کلام سے کم نہیں ہے،

"م"

ہندوستانی باشندوں کی مختلف علاقوں میں مختلف مادری زبانیں تھیں، مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں طالبانِ علم کو فارسی زبان کی تحصیل و تعلیم کی طرف متوجہ ہونا پڑا، کیونکہ ان کی دفتری اور کاروباری زبان فارسی تھی، اس لیے عربی علوم کی تحصیل کے شائقین کو بھی پہلے فارسی میں عمدہ استعداد و لیاقت بہم پہنچانا ضروری تھا، فارسی میں استعداد پیدا کرنے کے بعد ہی طلبہ عربی زبان اور عربی علوم کی تحصیل کی طرف توجہ کرتے تھے۔ ان کی سہولت کے پیش نظر عربی صرف، نحو، فلسفہ اور منطق وغیرہ کی مختصر اور ابتدائی کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ اور اساتذہ و طلبہ کی علمی رہنمائی کے لیے سیکڑوں عربی کتابوں کے حواشی، شرحیں اور تلخیصات وغیرہ کا کام فارسی زبان میں انجام دیا گیا، اس کے علاوہ لاتعداد عربی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے گئے، اور مسلم تعلیم و تہذیب کے تمام پہلوؤں پر فارسی زبان میں خامہ فرسائی کی گئی۔ فارسی کی تعلیم سے لغت فارسی کے محاورے، کہاوتیں، قصص اور تلمیحات وغیرہ ذہنوں پر گہرے نقوش چھوڑتے تھے، جن کا اثر قدرتی طور پر ہندوستان کے عربی گو شعرا کے کلام میں بھی نمایاں ہونا چاہیے تھا، اسی طرح مادری اور مقامی ہندی اثرات سے بھی یہاں کی عربی شاعری کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، ہندوستان کی عربی شاعری میں یہ عجمی اثرات کچھ تو ہندی یا فارسی محاوروں کے ترجمے ہیں اور کچھ قواعد کی غلطیاں، اس مضمون میں ہندوستان کے عربی شعراء کے کچھ اشعار نقل کر کے انھیں غیر عربی اثرات دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سمندر توحید

لولا شمول جمالکم فی ذاتی ‏ ‏ ‏ ‏ ماکنت ارضی ساعۃ بحیاتی[1]

(اگر آپکے جمال کی بے پایاں وسعتیں میری ذات میں موجود نہ ہوتیں، تو میں اپنی زندگی سے ایک گھڑی کے لیے بھی راضی نہ ہوتا)

عربی میں جمال اور ذات کا استعمال ایک ساتھ نہیں ہوتا، نیز ذات کے ساتھ جمال کا استعمال بمعنی خوبصورتی درست نہیں ہے، عربی میں ایسے مقام پر لفظ 'حسن' بولا جاتا ہے، لغت عربی میں لفظ 'ذات' کے معنی 'والی' و 'صاحبہ' ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں "ذات الجنب" اور "ذات الشمال" مذکور ہے، یونانی منطق و فلسفہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "نفس شے، ذات شے، فی نفسہ، فی ذاتہ، فی حد ذاتہ" وغیرہ الفاظ عربی زبان میں رائج ہوئے اور فارسی زبان میں لفظ ذات بمعنی حقیقت استعمال ہوا، اس شعر میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

امیر خسرو

یدعو البرایا مد ظل محمد ‏ ‏ ‏ ‏ وعداہ تعدم مثل ظل محمد[2]

(تمام مخلوق دعا کیا کرتی ہے کہ "سلطان محمد کا سایۂ عاطفت ان پر دراز رہے، اور حضرت محمد صلعم کے سایہ کے مانند اس کے دشمن نیست و نابود ہو جائیں!")

اس شعر میں امیر خسرو نے اگرچہ ذو معنی لفظ 'محمد' کا استعمال کر کے فن بدیع کی صنعت دکھائی ہے، مگر 'مد ظل محمد' فارسی محاورہ ہے، عربی میں سایے کی درازی کے لیے 'اظل' بمعنی 'صار ذا ظل' رائج ہے، فارسی دانوں نے ہی "مد الظل، مد ظلکم، دام الظل،

[1] مکتوب سید نقی حسن بلگرامی [2] اعجاز خسروی ۱: ۱۴۰

دام ظلکم، دامت اظلالکم" وغیرہ کو عربی مرکبات بنا کر استعمال کیا ہے۔

حتی علا فوق السماء سریرہ ‏ ‏ ‏ ‏ ورؤسھم غابت بہ تحت الثری[1]

(اس کا تخت شاہی رتبے میں آسمان سے بلند ہے، اور اسکے اعداء کے سر زمین کے اندر غائب ہوگئے)

پہلے مصرعے میں فارسی خیال ہے، دوسرے مصرعے میں 'رؤس' کے ساتھ 'غابت' کا استعمال عربی لغت کے مطابق نہیں ہے، عربی میں ایسے موقع پر باب مفاعلہ "واری، یواری، مواراۃ" کا استعمال کیا جاتا ہے۔

شیخ رکن الدین ملتانی

ثم الصلوۃ علی المختار من مضر ‏ ‏ ‏ ‏ خیر البریۃ من باکٍ ومتبسم[2]

(پھر قبیلہ مضر کی برگزیدہ ہستی پر رحمت کاملہ نازل ہو، وہ ہر خنداں اور گریاں مخلوق سے بہتر ہیں)

مخلوق کو 'باک و متبسم' میں منحصر کرنا لغت عربی کے موافق نہیں ہے، ہاں فارسی زبان میں 'خنداں و گریاں' رائج ہے، بظاہر اسی فارسی ترکیب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

قاضی عبد المقتدر شریحی

ثم اغتنم فرصۃ من قبل ان ضعفت ‏ ‏ ‏ ‏ قواک من سطوۃ الامراض والعلل[3]

(امراض و علل کے غلبے کے باعث اپنے قویٰ کمزور ہو جانے سے پہلے ہی اس فرصت کو غنیمت سمجھو)

"من قبل ان ضعفت" میں 'اَنْ' مصدریہ کے بعد فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی لایا گیا ہے، جو عربی قواعد کی صریح خلاف ورزی ہے، اور تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہاں 'اَن' نہ مخففہ ہو سکتا ہے، اور نہ حرف تفسیر، البتہ 'ان' زائدہ قرار دیا جاسکتا

[1] اعجاز خسروی ۱: ۱۵ [2] القصیدۃ التوفیقیہ (قلمی): ۱۲ [3] نقافۃ الہند، ج ۱ عدد ثالث: ۵

دیا جا سکتا ہے، اہل عرب نے حروف زوائد میں 'اُن' کو بھی بتایا ہے، اس صورت میں اگرچہ عجمیت کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے، لیکن کم از کم شاعر حرف زائد کے استعمال پر مجبور ہوا ہے، جو قادر الکلامی اور زبان پر عبور کے خلاف ہے،

لا تغترر بزمانٍ کان شیمته   ان غوّ غِرًّا بعته منه منتقل[1]

(زمانہ سے دھوکا نہ کھا، اس کی ریت یہی ہے کہ ناتجربہ کار جوان کو ناپائدار عزت کے غرور میں مبتلا کر دیتا ہے)

اس شعر میں صنائع کا تو ضرور استعمال ہوا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں جن الفاظ اور تراکیب سے مفہوم ادا کیا گیا ہے، وہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔

له المكارم ابهى من نجوم دجىً   له العزائم امضى من قنا البطل[2]

(آپ کے فضائل ظلمت اور تاریکیوں کے تاروں سے زیادہ روشن ہیں اور آپ کے عزائم بہادر کے نیزوں سے بھی زیادہ تیز و موثر ہیں)

عربی میں 'رمح' اور 'قناۃ' کی صفت 'ذبول' ہے اور 'ذابلۃ' کی جمع 'ذوابل' رماح (نیزوں) کے لیے صفت غالبہ کے طور پر مستعمل ہے، اس لیے 'قنا' کی اضافت 'بطل' کی طرف عربی زبان کے خلاف ہے، غالباً 'بطل' کا استعمال ضرورت قافیہ کے ماتحت کیا گیا ہے۔

له الفضائل أجدى من عصا كُبَتْ   له الشمائل احلى من جنى العسل[3]

(آپ کی خوبیاں ٹوٹی لاٹھی سے زیادہ منفعت بخش ہیں اور آپ کے خصائل چنے ہوئے شہد سے زیادہ شیریں ہیں)

اہل عرب کی مشہور مثل "انك خير من تفاريق العصا" ہے جو غنیہ اعرابیہ نے اپنے

۱؎ ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۵ ۲؎ ایضاً: ۷ ۳؎ ایضاً: ۷

بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے اس شعر میں استعمال کی تھی،

احلف بالمروة حقا والصفا   انك خير من تفاريق العصا

اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ لاٹھی سے بہت سے فائدے حاصل کیے جاتے ہیں، کمزور انسانوں کا لاٹھی کے ذریعے سہارا لینا، مویشی کے لیے درختوں سے پتے جھاڑنا اور معمولی لڑائی میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا وغیرہ، لیکن لکڑی کو توڑ دینے کے بعد اس کے فوائد میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، اس سے میخیں اور کھونٹیاں وغیرہ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا کر فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اس شعر میں شاعر نے اپنے الفاظ میں عربی مثل کا ترجمہ کر کے نہ صرف ناجائز تصرف کیا ہے بلکہ عربی اسلوب کی بھی مخالفت کی ہے، اور مدح نبوی کو بھی بھونڈا بنا دیا۔

یا اعظم الناس من حاجٍ ومعتمرٍ   واكرم الخلق من حافٍ ومنتعلٍ[1]

(اے سارے حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں سے بڑے، اور تمام ننگے پاؤں پھرنے والے اور جوتہ پہننے والوں سے زیادہ بزرگ!)

"من حاجٍ ومعتمرٍ" میں 'الحاج' کی مشدد جیم کو ضرورت شعری کی وجہ سے مخفف کر دیا گیا ہے، جو ناپسندیدہ ہے، اس کے علاوہ "الناس" کو حج کرنے والوں اور عمرہ ادا کرنے والوں میں منحصر کرنا اور مخلوق کو 'برہنہ پا و جوتہ پوش' میں محدود کر دینا اگرچہ عقلاً درست ہے مگر عربی محاورے کے خلاف ہے۔

بعثت بالملة البيضاء راسخة   عفا بها سائر الاديان والملل[2]

(آپ محکم اور واضح و روشن مذہب کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں، آپ نے اس مذہب کے ذریعے تمام ادیان و مذاہب کو مٹا دیا)

۱؎ ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۸ ۲؎ ایضاً: ۸

لغت عربی میں 'عفا' کا صلہ 'عن' اور 'لام' آتا ہے، چنانچہ "عفی عنہ" اور "عفی لہ" بولا جاتا ہے، یہاں 'عفا' کا صلہ 'ب' لایا گیا ہے، عربی زبان کے مطابق صحیح ترکیب "عفت علی سائر الادیان والملل" ہے، اگر صیغہ 'عفا' مونث استعمال ہوتا تو یہ جملہ ملت کی صفت قرار پاتا اور معنویت میں زیادہ حسن پیدا ہو جاتا۔

ندی الکف ما ینفد عنہ ابداً ۔۔۔ لکن ادناہ انداہ من ندی السبل [1]

(آپ کی سخاوت کبھی بھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ آپ کی ادنیٰ بخشش بارش کی سخاوت سے کہیں زیادہ ہے)

"ندی السبل" نہ تو محاورۂ عرب ہے اور نہ اس میں کوئی بلند پروازی ہے۔

شیخ احمد تھانیسری

ما زار طرفی غمض بعد بعدکم ۔۔۔ ولا خیال سرور دار فی خلدی [2]

(تم لوگوں کے فراق اور جدائی کے بعد میری آنکھ نے نیند کا لطف نہیں اٹھایا، اور نہ میرے دل میں مسرت کا کوئی خیال بھٹکا)

دوسرے مصرعے میں 'خیال سرور' فارسی کا اثر ہے، عربی میں 'خیال' محبوبہ کی اس تصویر کو کہتے ہیں جو خواب میں نظر آئے۔

فضیل بن جلال کالپوی

عجیب غریب معجز اہل عالم ۔۔۔ صنیع بدیع ما تحداہ ذو الفہم [3]

(فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" عجیب و غریب اور اہل عالم کو عاجز بنا دینے والی ہے، تفسیر ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ کوئی انسان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا)

'اہل عالم' فارسی ترکیب ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے "ذو الفہم" محاورۂ عرب کے

[1] ثقافۃ الہند، جلد اول، عدد ثالث: ۹ [2] ایضاً، جلد ثالث عدد اول: ۸۱ [3] سواطع الالہام ص ۲۳۸

خلاف، اور محض قافیہ پیمائی ہے۔

لہ الجود طبع والسخاوۃ عادۃ ۔۔۔ لہ الحلم شان بالجلال المکرم [1]

(جود و سخاوت اس کی طبیعت و عادت ہیں، اس کے علم کی ایسی شان ہو کہ اس میں قابل احترام جلال بھی ہے)

'الجلال المکرم' عربی ترکیب نہیں ہے۔

شیخ یعقوب صرفی

یا من بفیض کامل خصصت من ۔۔۔ علمتہ ما لم یکن ہو یعلم [2]

(اے وہ ذات جس نے کامل فیض سے اس ہستی کو مخصوص کیا جسے نامعلوم اشیا کی تعلیم دی ہے)

'فیض کامل' کی ترکیب بھی فارسی ہے اور اس کا مفہوم بھی فارسی ہے۔

فیضی

لاح دار الحمل، وحال الحول ۔۔۔ دار کاس المدام راس العام [3]

(برج حمل چمک اٹھا اور ایک سال ختم ہو گیا اور سال کی ابتدا پر جام مے گردش میں آ گیا)

'دار' اور 'کاس' مونث سماعی ہیں، اس لیے ان فاعلوں کے فعل عربی قواعد کے مطابق 'لاحت' اور 'دارت' ہونا چاہئیں، فیضی نے صرف صنعت مہملہ کی وجہ سے اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے، 'حال الحول' کے 'لام' کو بھی فارسی اثر کے تحت ساکن کیا گیا ہے، جب کہ عربی زبان میں دو ساکن حرف متصل نہیں ہوا کرتے۔

خواجہ حبیب اللہ نوشہری

مذہب العشق مذہب واحد ۔۔۔ اذہب اذہب علیہ یا زاہد [4]

[1] سواطع الالہام: ۲۳۸ [2] ایضاً: ۲۳۹ [3] موارد الکلم: ۸ [4] الانصاف فی بیان طریق النجاۃ (قلمی): ۹

(عشق کا راستہ صرف ایک ہے، زاہد! اُس راستے پر چلا چل)

یہ مصنف کی مثنوی کا شعر ہے، پوری مثنوی کا اسلوب، تعبیر، وزن اور ترکیبیں وغیرہ سب فارسی ہیں، صرف خیالات کو عربی الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

غلام نقشبند لکھنوی

اربع الحبیبة صار للوحش موطنا فیا عجبا من صنع دار محول[1]

(محبوبہ کی منزل وحشی جانوروں کا مسکن بن چکی ہے، سامعین! جائے تعجب ہے کہ مکان ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف کس طرح منتقل ہو گیا ہے)

پہلے مصرعے میں 'الحبیبة' سے وزن میں انکسار پیدا ہوتا ہے، اگر 'الحبیب' پڑھا جائے تو وزن درست ہو جائے گا، مگر وہ سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے، دوسرے مصرعے میں نحوی قوانین کے خلاف 'دار' کی صفت 'محول' مذکر لائی گئی ہے، اگر صفت کو مونث قرار دیا جائے تو قصیدے کا وزن اور یکسانیتِ قافیہ دونوں فوت ہو جاتے ہیں۔

لھا عارض تبریقہ غیر عارض اسیل صقیل حسنہ کالسجنجل[2]

(محبوبہ کے رخسار کی چمک عارضی نہیں ہے، نیز اس کا رخسار نرم و نازک ہے اور اس کا حسن آئینے کے مانند چمکدار ہے)

اس شعر کا پہلا مصرعہ محتاج تشریح ہے، نیز 'عارض' کی صفت 'اسیل' مصرعۂ دوم میں واقع ہے، اس لیے صفت و موصوف کے درمیان فاصلہ ہو جانے کے باعث تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا ہے، پھر 'صقیل' کا فاعل 'حسنہ' ہے، اور اس ترکیب کے ماتحت یہ معنی ہو گئے کہ محبوبہ کے رخسار کی خوبصورتی آئینے کی طرح پالش کی ہوئی ہے، حالانکہ پہلے مصرعہ میں صراحت ہو کہ

---

[1] نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر ۶: ۲۱۳ [2] ایضاً ۶: ۲۱۴

محبوبہ کا حسن ذاتی ہے، اور دوسرے مصرعے سے واضح ہوتا ہے کہ تصنع کو بھی دخل ہے، علاوہ ازیں حسن رخسار کا یہ انداز بیان بھی عربی نہیں،

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

ھنالک رسول اللہ ینجو لربہ شفیعا وفتاحا لباب المواھب[1]

(اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے مناجات کر رہے ہیں، دراں حالے کہ وہ خود شفیع اور بخششوں کا دروازہ کھولنے والے ہیں)

مصرعہ اول میں 'ینجو' کا صلہ 'ل' لغت عرب کے خلاف ہے، البتہ یہ توجیہ ممکن ہے کہ تصحیف کی وجہ سے 'یدعو' کی جگہ 'ینجو' تحریر ہو گیا۔

وعندی علوم لا یکاد یحیطھا سماء ولا بر و بحر و ساحل[2]

(میرے پاس علوم و فنون کا اتنا عظیم خزانہ ہے کہ ارض و سما اور سمندر و ساحل ان کا احاطہ نہیں کر سکتے)

'یحیط' کے بعد 'ب' صلہ نہ لانا محاورۂ عرب کے خلاف ہے، کیونکہ اس فعل کا مفعول براہ راست نہیں آتا، کلام مجید میں بھی "ولا یحیطون بشئ" ہے۔

میر عبد الجلیل بلگرامی

حبیبی قوس حاجبہ کنون وصاد ید ابن مقلة شکل عینہ[3]

(میرے محبوب کے ابرو کی کمان حرف 'ن' کی طرح ہے اور مشہور خوشنویس ابن مقلہ کا تحریر کردہ حرف 'ص' اس کی آنکھ کی شکل ہے)

لعمری انہ نص جلی علی ان الرمایة حق عینہ

(اپنی زندگی کی قسم! معشوق اس امر کی نص صریح ہے کہ تیر اندازی اسی کی چشم کا حق ہے)

---

[1] الطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم: ۶ [2] دیوان شاہ ولی اللہ (قلمی): ۲،۱ [3] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: ۸۱

حبیبی ثغرہ کالسین شکلاً — وکالمیم المدور شکل فیہ

(میرے معشوق کے دانت اپنی ترتیب وحسن میں حرف 'س' کے دندانوں کے مانند ہیں اور اس کے دہن کی شکل ٹھیک ٹھیک گول 'م' کی طرح ہے)

هما سم ویا عجباً حیاتی — اذا ما ذقتہ، لا شک فیہ

(معشوق کے دانت اور دہن دونوں زہر ہیں جس میں ذرہ اشک کی گنجایش نہیں، بس مجھے تعجب ہے کہ اسے دیکھ کر میں زندہ کیسے رہا؟)

مذکورۂ بالا اشعار کا انداز فکر عربی نہیں ہے، ان کو پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی ماہر فن خطاط یا فقیہ کے ہیں۔

آزاد بلگرامی

اصغیرتان علی بیاض خدودہا — او فی کتاب الحسن سلسلتان[1]

(ایا محبوبہ کے سفید رخساروں پر دو گیسو ہیں یا کتاب حسن میں دو سلسلے (مسلسل زاویے) ہیں) کتاب حسن خالص فارسی ترکیب ہے، عربی میں اس کا وجود نہیں۔

ابصر حواجبہا وادرك کنہها — غصنان منحنیان وسط البان[2]

(محبوبہ کے ابرووں کو دیکھو اور ان کی حقیقت سمجھو، بید کے (ملائم، لچکدار اور چھریرے تنے کے) درمیان میں دو پتلی پتلی ٹہنیاں سی نظر آتی ہیں)

پہلے مصرعے میں 'حاجب' کی جمع 'حواجب' استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ تثنیہ ہونا چاہئے، پھر دوسرے مصرعے میں ابرووں کو 'غصنان' بصیغۂ تثنیہ استعمال کیا گیا ہے جو صحیح ہے، مگر اس سے ایک ہی شعر کے دو مصرعوں میں یکسانیت مفقود ہو گئی۔

---

[1] نشوة السکران من صہباء تذکار الغزلان: ۹۷ [2] ایضاً: ۹۸

او کافران بیننا وران لیوقعا — اما لنا فی موقع الحرمان[1]

(یا دو کافر ہیں جنھوں نے باہم مشورہ کیا ہے کہ وہ ہماری تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیں گے)

ابرووں کو کافروں سے تشبیہ دینا اور ان دونوں کا امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے باہم مشورہ کرنا عجمی انداز فکر ہے۔

طال التجنب فاسمح بنظرة — وعلیك واجبة زکوة جمال[2]

(اے رخی اور بے التفاتی تو بہت ہو چکی، اب ذرا نظر کرم کیجئے، آپ پر تو حسن وجمال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے)

اس شعر میں فارسی زبان کے مفہوم کو عربی نظم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

فن الصبابة ما ادق بیانہ — تحیر فیہ الامام الرازی[3]

(عشق کے فن کا بیان کس قدر دقیق ہے کہ امام رازی بھی اس میں حیران وششدر رہے) اہل عرب عشق کے لیے لفظ 'فن' نہیں بولتے۔ فارسی اثر کے ماتحت 'فن' استعمال کیا گیا ہے۔

باقر آگاہ

یا من خیال خدودها فی مہجتی — حر الجحیم وفی عیونی الماء[4]

(اے محبوبہ، تیرے رخساروں کے تصور سے میرے دل میں جہنم کی گرمی بھر گئی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں)

---

[1] نشوة السکران: ۹۸ [2] حدیقة الافراح لازاحة الاتراح: ۳۴۴ [3] ایضاً: ۳۴۲

[4] النفحة العنبریة فی مدح خیر البریہ (قلمی): ۴۵

شیخ احمد تھانیسری کی طرح باقر آگاہ نے بھی 'خیال' کو فارسی معنی کے مطابق استعمال کیا ہے،

وسریت نحوی کالنسیم تلطفاً — فصفقت من طرب: أفاح ذکاء[1]

(اے محبوبہ: تو جو میری طرف از راہ لطف وکرم بادِ نسیم کی مانند چل کر آئی تو میں نے فرطِ شوق سے بآوازِ بلند کہا: کیا آفتاب طلوع ہوا؟)

'ذکاء' عربی زبان میں مونث ہے، اس لیے 'فاح ذکاء' کی جگہ 'فاحت ذکاء' ہونا چاہیے، مگر اس سے عروض کے قواعد کی خلاف ورزی ہوتی، اس کے علاوہ "فاح، یفوح، فوحاً" کے معنی خوشبو دینا ہے، اور آفتاب وخوشبو میں دور کی بھی مناسبت نہیں ہے، محبوب کو چمک دمک اور آب وتاب کے لحاظ سے ہی آفتاب سے تشبیہ دی جاتی ہے، اس لیے 'فاح' کا استعمال غلط طور پر کیا گیا ہے۔

ھو روح کل الکائنات فکیف لا — یصبوالی امدادہ الاشیاء[2]

(محمد ہی ساری کائناتِ عالم کی روحِ رواں ہیں، اس لیے کائنات کی تمام اشیاء کا آپ کی امداد واعانت کی طرف مائل نہ ہونا کس طرح ممکن ہے؟)

یہاں فارسی کے زیرِ اثر 'کائنات' کو استعمال کیا گیا ہے، عربی میں اس مفہوم کو 'عالم' اور 'عالمین' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح 'امداد' کو بھی نصرت واعانت کے معنی میں استعمال کرنا فارسی کا اثر ہے، عربی میں امداد کے معنی دراز کرنا ہیں،[3]

لقد قامت الرسل فی بابه — یرومون من فیضه منصبا[4]

[1] النفحۃ العنبریۃ فی مدح خیر البریۃ (قلمی): ۵۴ [2] ایضاً: ۴۶ [3] معارف: یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، خود کلام مجید میں امداد نصرت کے معنی میں آیا ہے: "الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ آلاف من الملٰئکۃ" [4] النفحۃ العنبریۃ: ۶۲۔

(تمام انبیاء ورسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے پر حاضر ہیں، اور سب ہی آپ کے فیض سے منصب کے خواہاں ہیں)

مصرعۂ دوم میں 'فیض' اور 'منصب' عربی لفظوں کو فارسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

یلوح فی فرعها قلبی الاسیر کما — یبدو الحباحب بین السنبل البهج[1]

(میرا اسیر دل معشوقہ کی چوٹی میں اس طرح چمکتا ہے جیسا کہ سرسبز خوشۂ گندم میں جگنو)

پہلے مصرعے میں فارسی خیال کو عربی الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وزیر علی سندیلوی

الفہ علیّ انواع البلاء — اذا القیتُ نفسی فی الھواء[2]

(جب میں نے اپنے دل میں عشق کو جگہ دی تو انواع واقسام کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا)

اس شعر میں 'الھواء' کے ہمزہ مقصورہ کو ممدودہ بنا دیا گیا ہے، اہل عرب 'الھوی' ہمزہ مقصورہ کے ساتھ بولتے ہیں۔

قاضی عمر بلنکوتی

جفتنی، فذ بتنی، فغطت بغیطة — فذ بت بشجن بین جنبی لیشفق[3]

(محبوبہ بدسلوکی کے ساتھ مجھ سے پیش آئی، اور مجھے دھکے دیے، پھر سخت غیظ وغضب کا اظہار کیا، بعد ازاں ایسا غم واندوہ دیکر نکال دیا، جو میرے پہلوؤں کے درمیان کسک پیدا کرتا رہتا ہے)

عربی میں جھنڈوں اور ستاروں وغیرہ کے اضطراب کے لیے 'خفق' استعمال ہوتا ہے 'شجن' کی صفت عربی محاورے کے مطابق نہیں ہے۔

[1] دیوان غزلیات آگاہ (مخطوطہ) [2] دیوان وزیر علی سندیلوی (قلمی) [3] جواہر الاشعار فی غرائب الحکایات والاخبار: ۲۸۲

آثارِ تاریخیہ

مکاتیب شبلیؒ

بنام

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے اپنے نام مولانا شبلی کے وہ خطوط جو ندوہ کے اختلافات سے متعلق تھے، مکاتیب شبلی میں اشاعت کے لیے نہیں دیے تھے اس لیے وہ اس میں شامل نہیں ہوسکے، اس کی نقل ان کے پوتے ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے عرصہ ہوا ہمارے پاس بھیجی تھی، ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جن کی اشاعت نامناسب ہو، مولانا شروانیؒ نے محض اپنی محتاط طبیعت کی بنا پر ان کو روک لیا تھا، مولانا شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر ترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور ان خطوط سے ندوہ سے ان کی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، اور اس دور کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ان تاریخی خطوط کو شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ "م"

(۱)

مکرمی!

آج کی ڈاک میں آپ کے خط کے ساتھ ناظم صاحب کا بھی خط آیا، اسکے الفاظ یہ ہیں:

"جلسۂ انتظامیہ میں آپ کی اڈیٹری اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی اڈیٹری اور مولوی سید عبدالحئی صاحب کی جنتی طے ہوگئی، چنانچہ اول منشی صاحب ہی سے رائے لی گئی، ان کو بجز اقبال کے کوئی چارہ نہ تھا، بعد کو باتفاق پاس ہوا، اب فقط سرکار سے اجازت طلب کرنا چاہیے، میرے نزدیک جلسہ سے قبل اشتہارات شائع ہوجائیں اور جلسہ میں رسالہ تیار ہوکر موجود رہے تو اور بھی بہتر ہوگا، ورنہ اشتہار تو ضرور اس وقت تک طبع ہوجائیں"۔

اب فوراً ٹائٹل پیج بھیجیے اور مولوی عبدالحئی صاحب کو لکھیے، گورنمنٹ میں درخواست دیدیں۔

کیا اشتہار بھی بغیر وصولی حکم اجازت نہیں چھاپا جاسکتا، پہلے پرچہ میں آپ کا کوئی مضمون بھی ضروری ہے، ورنہ ایک دو پرچہ کے لیے تو خود میرے مضامین بھی موجود ہیں، جلدی فرمائیں۔

شبلی - ۱۵ نومبر ۱۹۰۳ء

(۲)

مکرمی!

براہ کرم مولانا خلیل الرحمٰن صاحب کو راضی کر دیجیے کہ مولوی فضل حق مدرس مدرسۂ عالیہ رامپور کی پرنسپلی پر راضی ہوجائیں، ٹونکی صاحب کو مفصل اور نہایت عاجزانہ خط لکھے گئے، جواب ندارد، مولوی فضل حق صاحب، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پروفیسر رہ چکے ہیں، شاہ سلیمان صاحب، مولوی عبدالحئی صاحب ان کے معترف اور اس عہدہ کے لیے ان کو موزوں تر سمجھتے ہیں، صرف منشی احتشام علی اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب، مولوی

حفیظ اللہ صاحب کو دوبارہ بلانے کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مخالف ہیں، پورے چھ مہینے ہوئے کہ عہدہ خالی اور تمام پڑھائی غارت ہے، اب فرمائیں میں کیا کروں، آپ بطور خود لکھئے اور اس مرحلہ کو سر کیجئے، پرنسپل لائق آجاتا تو میں اور کاموں کی طرف متوجہ ہوتا،

شبلی - ۳۰ / اپریل ۱۹۱۰ء

(۳)

جناب من ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کو معلوم ہوگا کہ ارکانِ انتظامیۂ ندوہ کی میعادِ ممبری ختم ہوگئی، اور ۴۸ ارکان کے انتخاب کی ضرورت ہے، میرا خیال ہے کہ آپ نے ابتک لوگوں کے نام انتخاب کرکے دفتر میں نہیں بھیجے ہیں، اس لیے امور ذیل گذارش ہیں :-

(۱) آپ ۴۸ آدمیوں کے نام پیش کرسکتے ہیں،

(۲) فہرست ارکان سابق مرسلہ مولوی عبدالحئی صاحب آپ کے پاس موجود ہوگی، اس کو پیش نظر رکھکر، جو بزرگ قابل انتخاب ہوں، ان کے نام انتخاب کیجئے، یہ انتخاب یا ان بزرگوں کی قابلیت علمی اور وجاہت دنیوی کے لحاظ سے ہو، یا اس لحاظ سے ہو کہ اُن لوگوں نے زمانہ ممبری میں عمدہ کارگزاری اور ہمدردی کا اظہار کیا،

(۳) جدید ارکان انتخاب کیجئے، یعنی ہر صوبہ کے مشاہیر اور ذی اثر اشخاص کو لیجئے، مثلاً مدراس میں مولانا عبدالسبحان، نواب غلام احمد خاں، بمبئی میں قاضی کبیرالدین، مولوی رفیع الدین بیرسٹر، حاجی یوسف شعبانی، کلکتہ میں مولوی شمس الہدیٰ، مولوی یوسف، پنجاب میں مسٹر محمد شفیع، شیخ غلام صادق، بابو نظام الدین، ممالک متحدہ میں بہت سے لوگ ہیں، جن کو آپ خود جانتے ہیں،

(۴) آپ خود اپنا نام بھی پیش کرسکتے ہیں،

(۵) مدت نامزدگی کم رہ گئی ہے، اس لیے فوراً دفتر میں منتخب اشخاص کے نام بھیجدینے چاہییں،

(۶) دستور العمل کی رو سے انتخاب ارکان کا جو جلسہ ہوگا، اس میں صرف زبانی ووٹ (رائے) لیجائے گی، تحریری ووٹ کافی نہیں، اس لیے جب جلسہ کی تاریخ کی اطلاع دیجائے، تو جلسہ میں آپ کو خود تکلیف فرمانا چاہیے، یا بصورت مجبوری وہاں کے کسی معزز صاحب کو بھیجنا چاہیے

(۷) انتخاب ارکان کے لیے ووٹ دینا ارکان انتظامی پر محدود نہیں، بلکہ ہر ممتاز شخص ووٹ دے سکتا ہے، صرف یہ شرط ہے کہ چار آنے بھیجکر ندوہ کا ممبر بنجائے اور موقعۂ انتخاب پر موجود ہو،

شبلی - ۱۰ / جنوری ۱۹۱۱ء

علما میں حضرات ذیل قابل انتخاب ہیں :

مولانا لطف اللہ مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولوی عبداللہ غازیپوری، مولوی ثناء اللہ امرتسری، ابوبکر شہاب عرب حیدرآباد، مولوی حمیدالدین پروفیسر عربی یونیورسٹی الہ آباد-

(۴)

مکرمی !

وہ کارڈ سرسری تھا، آپ غور اور سنجیدگی کے ساتھ سنیے کہ کام کیونکر چل سکتا ہے، ایک ایک امر کو لیجئے۔

عمارت

(۱) عمارت کا کام یوں شروع ہوسکتا ہے کہ تعمیر اور جداگانہ کمروں کیلئے جو روپے آئے تھے، جن کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے، پہلے ان سے کام شروع کیا جائے،

اور دوسرے لوگوں کو ترغیب دیجائے، آٹھ سات ہزار کے مستحکم وعدے ہیں، وہ فوراً
مل سکتے ہیں، اگر ان کو یقین ہو کہ کام شروع ہو رہا ہے، لیکن یہ اس پر موقوف ہے کہ
جمع شدہ رقم کا پہلے ٹھکانا لگے، میں نے چند دفعہ کہا کوئی جواب نہیں ملا، تعمیرات کا کوئی
بجٹ نہ شائع ہوا نہ جلسہ میں کبھی پیش ہوا، کچھ معلوم نہیں کہ وہ رقمیں موجودہ تعمیر میں
صرف ہوگئیں یا جمع ہیں، اور جمع ہیں تو ان سے کام کیوں نہیں شروع ہوتا، ان حالات
کے سوا کیا میں لوگوں سے چندہ مانگ سکتا ہوں، اور کیا موعودہ رقمیں مل سکتی ہیں،

(۲) دو دفعہ جلسۂ انتظامیہ مدراس وغیرہ میں یہ طے ہو چکا کہ موجودہ عمارت
فروخت کر دیجائے، میں نے خریدار ٹھہرایا اور بہت زیادہ قیمت پر، لیکن منشی صاحب نے
انکار کیا کہ مجلس انتظامیہ کو بھی جائداد کے فروخت کرنے کا اختیار ہی نہیں،
تین چار مراسلات کے بعد میں چپ ہوگیا، وہ رقم ملتی تو موجودہ عمارت پوری ہو جاتی
اور طلبہ کی بھی بقدر حالت گنجائش نکل آتی،

(۳) راجہ جہانگیر آباد کو ہر طرح منہ پھوڑ کر کہہ چکے، ان سے کچھ ملنے والا نہیں،
محمود آباد سے قوی امید ہے، لیکن ان کو کوئی عہدہ دیا جائے، دستور العمل میں سرپرست
ہر شخص ہو سکتا ہے، لیکن مولوی خلیل الرحمن صاحب نے انکار کیا کہ وہ شیعہ ہیں ......(؟)
دونوں کو بنا سکتے ہیں، لیکن یہ بھی منظور نہیں، راجہ صاحب محمود آباد بورڈنگ کا پورا
پانچواں حصہ بنوا دیں گے،

اب جب ہر طرف سے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں تو یہ اعجاز صرف آپ کر سکتے
ہیں کہ کام ہی کریں، باقی یہ کہ عام چندہ کھولو، تو کہنا آسان ہے، لیکن کامیابی حاصل
کرنا آسان نہیں،

تعلیم کا بھی یہی حال ہے، لیکن کون اس داستان کو سنائے۔

شبلی - ۱۴ مئی ۱۹۱۱ء

(۵)

مکرمی! تسلیم

خط اور ترجمہ پہنچا، اس میں تو کہیں کہیں چوٹیں ہیں، ناگیویس کا تو ایک حرف
بھی خالی نہیں،

ندوہ کا معاملہ اس قدر مشکل نہیں جتنا آپ کے خیال میں ہے، آپ اپنی آزادگی
تو ہمیشہ ظاہر کرتے ہیں، لیکن آپ کو کبھی یاد ہے کہ آپ ایک ہفتہ ٹھہرے، آپ ہر دفعہ کی
مجموعی تعداد کو ملا کر دیکھتے ہیں، اور میں ایک دفعہ چاہتا ہوں، تہ کی بات تو صرف
اس قدر ہے کہ ایک صرف مولوی خلیل الرحمن صاحب بیچ میں نہ ہوں تو کچھ دشواری
نہیں، منشی احتشام علی دو فقرے میں رام ہوتے ہیں، آخر میرا بھی تو ان سے سابقہ
رہا، خیر ضابطہ کی یہ بات ہے کہ صرف دو تین امور ہیں،

(۱) پرنسپل کو وہ اختیار کامل دیدیے جائیں جو عموماً پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کو ہوتے
ہیں، اب تو یہ حالت ہے کہ وہ ایک آنہ کا جرمانہ تک نہیں کر سکتے یا کسی مدرس کے
متعلق کوئی حکم ان کا نافذ نہیں،

(۲) انگریزی اسٹاف کی حالت نہایت خراب ہے، ہیڈ ماسٹر بہرے اور سخت
کاہل ہیں، لیکن چونکہ دوسری پارٹی ان کی حمایت میں ہے، وہ کچھ نہیں سنتے، تین دفعہ
تین شخصوں نے ان کے کلاسوں کا معائنہ کیا، یعنی مولوی ظہور احمد وکیل، مولوی عزیز مرزا،
ڈاکٹر ناظر الدین حسن، تینوں نے سخت شکایت کی، پہلی دو شخصیتوں کی تحریری رپورٹ

موجود ہے، مجلس دار العلوم میں یہ مسئلہ پیش ہوا، اور ان کے ایماء سے دونوں رپورٹیں ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیجی گئیں، تین مہینے ہوئے جواب ندارد،

اس کا انتظام ہونا چاہیے، ورنہ جو کچھ انگریزی پر خرچ ہو رہا ہے، سب بیکار جاتا ہے، اور ایک دن ایڈ بند ہو جائے گی،

(۳) باقی میرا اور معتمد ال کا معاملہ ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ دونوں کے اختیارات کی تعیین ہو جائے، وہ ہر مہینہ میں جس کی تنخواہ یا وظیفہ چاہتے ہیں روک دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علاوہ اور نقصانات کے، مدرسین پر ڈسپلن قائم نہیں رہا، اور دو گروہ ہو گئے،

یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ کچھ آشتی اور کچھ باپابندی قاعدہ طے ہو جائیں گی، آپ اور مولوی عبد الحئی صاحب اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب قدوائی، تین شخص حکم بن جائیے، سب باتیں سنیے، کچھ فیصلہ کر کے دونوں فریق کو سنائیں، دونوں کے عذرات سنیے، غور تو کیجئے، ہزاروں لاکھوں روپے کی بربادی، کام کی ابتری، نام بدنامی، ترقی کی روک، ان سب کاموں کی قیمت آپ کا ایک ہفتہ بھی نہیں ہے، کام کرنے سے ہوتا ہے نہ ہمت ہارنے سے۔

شبلی - ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۲ء
بمبئی

(۹)

مکرمی! تسلیم

ترکی کے واقعات نے تو اس قدر دل بجھا دیا ہے کہ کسی کام کو جی نہیں چاہتا،

تاہم آخر جینا مرنا، کھانا پینا تو نہیں چھوٹ سکتا، ندوہ کا ایک مقصد ہے جسکو گوش گذار کرتا ہوں، آپ کا اور ہم سب لوگوں کا ندوہ سے ایک معمولی مدرسہ مقصود نہ تھا، مگر خانہ جنگیوں نے وہ سب منصوبے غلط کر دیے،

میرے سامنے جو خاکہ ہے اس کو بتفصیل آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ معقول مشورہ اور تدبیریں قائم ہو سکیں، اس کے لیے یا تو کانفرنس سے ۵ دن پہلے یہاں آئیے، میں نے اپنے کمرہ کے برابر کا کمرہ بھی لے لیا ہے، نہایت آرام اور سکون سے آپ رہ سکیں گے۔

جو خاکہ ہے اس کی کامیابی اس پر موقوف ہے کہ تمام ہندوستان کو ندوہ میں عملاً شریک کیا جائے، اس کے لیے ضرورت ہے:

(۱) ارکان کے دائرہ کی وسعت، اس کے ساتھ شعبۂ دینی وغیرہ کی قید سے سبکدوشی جیسا کہ ندوہ کے پچھلے سالوں میں تھی،

(۲) تعلیم کے مختلف شعبے قائم کرنے، جیسا کہ آپنے وقار الملک کی مجوزہ نیشنل یونیورسٹی کے پروگرام میں دیکھا ہوگا، یعنی جس کی بدولت وہ امراء و تجار بھی مذہبی اور دنیوی علوم پا سکیں، جو یونیورسٹی کے امتحانات کے شایق نہیں۔

(۳) اشاعت اسلام کا عملی کام۔

اس بات سے آپ مطمئن رہیں کہ کوئی چیز عسیر الحصول نہیں، اور نہ میری کوشش کی دستگاہ سے باہر ہے، آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اچھا خاکہ مرتب ہو جائے اور نیز یہ کہ دو صاحب خلل انداز نہ ہوں، اصل مصیبت یہی ہے،

آپ نہ آ سکیں تو میں آؤں، ۲۰ر کو ہز آنر نے ملنے کا وقت مقرر کیا ہے، ورنہ میں ابھی سے آجاتا، بہرحال تسلی بخش جواب دیجئے،

شبلی - ۹ر دسمبر ۱۹۱۲ء

(۷)

مکرمی!

اگرچہ تین چار دن کی متصل محنت اور ہنگامہ کے بعد دماغ تھک چکا ہوگا، تاہم خیر آپ آئیں تو سہی اور دو چار دن قیام کریں، لیکن جو امور فیصلہ کن ہیں ان کے صرف اتفاق رائے سے کچھ فائدہ نہیں، بلکہ استواری اور پامردی کی ضرورت ہے، امور فیصلہ کن یہ ہیں:

(۱) عمارت کی تکمیل، اس میں تمام تر دقت یہ ہے کہ سکرٹری تعمیرات کا دفتر ایسا ہے کہ نہ کوئی حساب شائع ہوتا ہے، نہ کچھ پتہ لگتا ہے، نہ پوچھنے سے جواب ملتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مقامی اشخاص اپنا چندہ ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اور سلسلہ بسلسلہ باہر تک یہ اثر جاتا ہے، ماسٹر شاہد حسین نے ڈائرکٹر سے کہا کہ گورنمنٹ نے مدد دی ہے، انھوں نے اسٹمنٹ اور حساب مانگا، معتمد صاحب تعمیرات نے جو جواب لکھا ہے اور میرے پاس آیا ہے، اس کو دیکھئے گا، انکار اور پہلوتہی ہے، فروخت مکانات کا معاملہ بھی اسی میں ہے.

(۲) آیندہ ...... کام مجلس تعمیرات کا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، نہ کبھی ہوگا،

(۳) ندوہ کی طرف عام ملک کا رجحان اس پر موقوف ہے کہ ہر حصہ کے لوگ ممبر بنائے جائیں، یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ پرائیوٹ کوششوں سے ممبری انھی پچھلے اشخاص میں محدود رکھی جاتی ہے.

(۴) غرض تمام اسکیم میں مقدم یہ ہے کہ کچھ پامردی اور استقلال دکھایئے، صرف ایک ہفتہ کافی ہوگا، پھر برسوں کے لیے کام چل پڑے گا۔

شبلی - ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۲ء

(۸)

مکرمی!

ابھی آپ کے نام ایک خط لکھ چکا تھا، کہ آپ کا خط ملا، افسوس ہے کہ آپ اس حیثیت سے

کام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں کہ اصل کارکن کوئی اور ہے اور آپ صرف مامور ہیں، یہی چیز ہے جس نے آج تک ندوہ کو عضو معطل رکھا ہے،

اجازت اس میں لیجاتی ہے جو نا طے شدہ مسئلہ ہو، رسالہ کا نکلنا، روپیہ کی منظوری، آپ کی اڈیٹری یہ سب طے شدہ اجلاس سابق ہے، روز روز اجازت نہیں لیجاتی، البتہ میرا اڈیٹر ہونا طے شدہ نہیں ہے، اس کو جانے دیجئے، یوں ہی سہی، آپ کو خود ہی اختیار ہے کہ کسی اور کو شریک اڈیٹری کرلیں، اسکے لیے عام اجازت مانگیے تو سب دیدینگے، ہاں خاص میرا نام لیجئے گا تو وہ رے اٹکائینگے، اچھا تو گیا اس خلاصی سے ندوہ کا کام چلے گا.

مکرمی! اب مداہنت اور جھوٹی رعایت کا وقت نہیں ہے، انگریزی تعلیم چھاتی جاتی ہے، اس دفعہ یہاں یہ تجربہ ہوا کہ کانفرنس کے آگے لوگ ندوہ کا نام لینے والوں کو دشمن سمجھنے لگے، حیدر آباد میں کالج کی ایک بڑی پارٹی ہے، ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ دونوں کے ڈپوٹیشن کی موجودگی میں ندوہ سے بالکل الگ رہوں، دو عام جلسوں میں مجھے اس مسئلے پر بولنا پڑا، لوگ ناراض بھی ہوئے اور میری مقبولیت میں فرق آیا، لیکن بیدردی اور بے جھجک سچ کہا گیا، میں نے صاف کہدیا کہ کالج اگر یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ ہماری مذہبی ضرورتوں کو بھی پورا کر دیگا تو محض جھوٹ ہے، سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کے سامنے یہ الفاظ کہے گئے، ندوہ کی بیکاری جس قدر ثابت ہوتی جاتی ہے، اسی قدر مخالفوں کو صریح شہادت ہاتھ آتی جاتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ندوہ قوتوں کو پراگندہ کرتا ہے، اس لیے صرف ایک کالج کو مرکز بنانا چاہیے،

ایسی حالت میں آپ ایسے کمزوریات سے کام لیتے ہیں اور ایسا سست ہات آپ کا اٹھتا ہے!! نصاب کی متفق علیہ کتب کو فوراً جاری کر دیجئے، مختلف فیہ کو رہنے دیجئے، تو کچھ ہرج نہیں، رسالہ بالکل اختیاری ہے، اس میں بھی دفتر کا منہ دیکھنا کیا معنی، آپ اگر گرتے پڑتے ہیں تو کون ثابت قدم رہے گا۔

شبلی - ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

باب التقریظ والانتقاد

"تاریخ بنگالۂ مہابت جنگی"

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مذکورۂ بالا تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہوئی ہے، اب سے پہلے اس سوسائٹی نے بہت سی فارسی اور عربی کتابیں شائع کرکے بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی بہت سی فارسی تاریخیں اس سوسائٹی کی وجہ سے اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچیں، جن میں تاریخ بیہقی، طبقاتِ ناصری، تاریخ فیروز شاہی (برنی) تاریخ فیروز شاہی (عفیف)، ظفرنامہ، تاریخ مبارک شاہی، اکبرنامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، ماثر رحیمی، شاہجہاں نامہ، عالمگیرنامہ، ماثر عالمگیری، منتخب اللباب ماثر الامراء، اور ریاض السلاطین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی مفید حواشی کے ساتھ شائع ہوئے، دو چار کو چھوڑ کر یہ کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی نہیں رہ گئی ہیں، ان کے نہ ملنے کی وجہ سے ان مطبوعات کی حیثیت مخطوطات کی ہو گئی ہے، اور جہاں ہیں وہاں انکے اوراق ایسے بوسیدہ اور خستہ ہو گئے ہیں کہ ان کا الٹنا بھی مشکل ہو گیا ہے، یہ ایشیاٹک سوسائٹی ہی کی ملکیت ہیں، اگر اسکی طرف سے ان کا نیا اڈیشن شائع ہو، تو یہ نئی کتابوں کی اشاعت سے کم مفید علمی خدمت نہ ہوگی، امید کہ سوسائٹی کے ارکان اس کی طرف توجہ کریں گے۔

"تاریخ بنگالۂ مہابت جنگی" مصنفہ یوسف علی خاں کو ڈاکٹر عبد السبحان استاد زبان و

وادبیاتِ فارسی، مولانا آزاد کالج کلکتہ نے اڈیٹ کیا ہے، اور وہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی غالباً کر چکے ہیں، اس محنت کے صلہ میں ان کو کلکتہ یونیورسٹی سے ڈی۔ فل کی ڈگری بھی ملی ہے، انھوں نے اس پر انگریزی میں ۴۹ صفحے کی ایک تمہید لکھی ہے، جس میں اس کتاب کی اہمیت دکھائی گئی ہے، شروع میں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر اے، جے، آربری کا ایک مختصر پیش لفظ بھی ہے،

اس کتاب میں بنگال کے نواب مہابت جنگ علی وردی خاں (۱۷۴۰ - ۱۷۵۶ء) اور نواب سراج الدولہ (المتوفی ۱۷۵۷ء) کے تاریخی حالات ہیں، اس کی اہمیت اسلیے ہے کہ اس کا مصنف یوسف علی خاں دونوں نوابوں کا معاصر ہے، اس کا باپ مہابت جنگ علی وردی کا بڑا معتمد اور وفادار ہمجلیس رہا، اس کی شادی علی وردی خاں کے آقا اور پیشرو نواب شجاع الدولہ کے لڑکے نواب سرفراز خاں کی لڑکی سے ہوئی،

یہ کتاب اس لحاظ سے تو ہندوستان کے تاریخی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے کہ اس سے اٹھارہویں صدی کے بنگال کے بہت کچھ واقعات معلوم ہو جاتے ہیں لیکن یوسف علی خاں کو ایک غیر جانبدار مورخ کہنا صحیح نہیں ہوگا، راقم نے اس کتاب کے اس حصہ کو زیادہ دلچسپی سے پڑھا جس میں سراج الدولہ کے حالات ہیں، بنگال کا یہ جانباز نواب جب ہلاک کیا گیا تو اس وقت اس کی عمر کل ۲۴ سال کی تھی لیکن وہ اپنا نام ہندوستان کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھنے کے لیے چھوڑ گیا ہے، اس نے کل ایک سال تین مہینے تک بنگال میں حکومت کی، اس قلیل مدت میں اس کی رزمیہ داستان اچھی خاصی طویل ہے، وہ جانکی رام، شوکت جنگ قاسم بازار اور کلکتہ کے انگریز تاجروں سے لڑا، علی نگر کی صلح کی، پھر پلاسی کی جنگ کی۔ اس کی جنگی کارروائیوں میں غاصب انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا قابل قدر

جذبہ بھی شامل رہا، جو اس کو ظالم، سفاک، غایت بدزبان کہکر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے،
یوسف علی خاں نے اس کی موت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے،

سراج الدولہ کہ بحکومت عالمی اکتفا نداشت و راضی نمی گشت و از مہیبت ظلم و کمال سفاکی و غایت بدزبانی او زہرۂ ہژبران آں دیار آب می گشت با کلاہی بر سر و آزادی در پا دیک لائی بر دوش داشتہ در آں حال تمنائی محقر گوشۂ دنیا از اہل دنیا نمود و چون وجود نابود او باعث مفاسد عظیمہ می شد بآں تمنا نیز ہم آغوش نگشتہ بحکم حاکم شدید الانتقام شمشیر قضا قطع سررشتۂ جمیع تمنیات او فرمود، بفرمان میر محمد جعفر خاں بہادر نزد مہابت جنگ مرحوم مدفون ساختہ ۔" (ص ۱۷۰ - ۱۶۹)

مذکورۂ بالا اقتباس میں سراج الدولہ کی ایک بری تصویر پیش کی گئی ہے میر جعفر کو ننگ قوم و ننگ دین و ننگ وطن قرار دیا گیا ہے، وہ اپنے زمانہ میں کلائیو کے گدھے کے نام سے مشہور ہے، اس کی غداری اب ضرب المثل بن گئی ہے اسی نے سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دلائی، اور آخر میں اس کو قتل کرایا، اس کے صلہ میں انگریزوں سے بنگال کی نظامت پائی، لیکن اس کتاب میں ان سب پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، ایک جگہ تو اس کی حرمت و عزت کی پاسداری بھی کی گئی ہے، (ص ۱۳۶)، اس کے مقابلہ میں کلکتہ میں سراج الدولہ کی حرکت مذبوحی، نہب و تاراج، غارت گری، آتش زنی، سوانگریزوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں محبوس کرنے کا ذکر بہت طمطراق سے کیا گیا ہے (ص ۱۸۵)۔ یہ تمام باتیں شہادت دے رہی ہیں کہ یہ کتاب انگریزوں کے زیر اثر لکھی گئی۔ ڈاکٹر عبد السبحان نے تمہید میں لکھا ہے کہ

اس کے مصنف کے تعلقات یورپین حکام سے دوستانہ تھے (ص ۲۵)، غالباً اس دوستی کا حق یہ کتاب لکھ کر ادا کیا۔ ڈاکٹر عبد السبحان کو بھی مصنف کی غیر جانبداری پر زیادہ اعتماد نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنی تمہید (ص ۳۰) میں اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے، مگر اس اجمال کو تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، انھوں نے معلوم نہیں اس کتاب کے متعلق یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ

It helps us to broaden our estimate of the Nawab's (Siraj-ud Dawlah's) character (p. 8)

حالانکہ اس کتاب کے مطالعہ سے نواب سراج الدولہ کی بہت بری تصویر سامنے آتی ہے مثلاً

"سراج الدولہ کہ چشم طمع بر اموال و ذخائر کلکتہ دوختہ بود۔" (ص ۱۵۷)

دریں چند روز کہ حرکت المذبوحی می کرد تمامی شہر کلکتہ بباد غارات و تاراج رفتہ، اکثر و اقمشۂ اطراف و اکناف بلاد و امصار ہزاراں دلکہا کہ از قریب صد سال در آں شہر از حوادث روزگار مصون و محروس بود، بہ نہب و تاراج آمد (ص ۱۵۸)

و قریب صد نفر فرنگان کہ دراں روز اسیر پنجۂ تقدیر شدہ بودند ہمہ آنہا را در حجرہ محبوس نمود و ضبط و نسق کوٹھی را ببعضی از سرداران رجوع کردہ و از کوٹھی برآمدہ در یکے از خانہای فرنگان قرار گرفت از قضا در حجرہ کہ فرنگان رفتہ بودند، تمامی آنہا مخنوق گشتہ رہ بوادی عدم آوردند و قریب بست و سی نفر دیگر کہ در ایام محاصرہ بضرب بندوق وغیرہ کشتہ شدہ بودند نفرہان پاچہ را بر روی یکدیگر در خندق کوٹھی انداختند (ص ۱۵۸)

سراج الدولہ کہ از فتوح سابق مخمور بادۂ غرور بود اصلاً التفات و اعتناء با نجاح مطالب فرنگان نکردہ (ص ۱۶۲)

واز رقدۂ جہالت و نوم غفلت متنبہ نگشتہ بر صفات ذمیمۂ خود کہ باعث تنفر خاص و عام می شد اصرار نمود .... درخشونت مزاج و اذیت خاص و عام از طبقۂ سپاہ و ارباب کرام و لیام بیشتر از بیشتر افزود .. (ص ۱۶۴)

سراج الدولہ حواس باختہ و دست و پا گم کردہ در فکر ایں بلیۂ نازلہ افتاد (ص ۱۶۶) واز کردار ناہنجار خویش کہ در طی ایں حالات نسبت بجان مشار الیہ یعنی میر محمد جعفر خان بعمل آوردہ بود اظہار ندامت و انفعال کردہ (ص ۱۶۶)

گولۂ توپ بہ میر مدن کہ بخشی دوم سراج الدولہ و محل اعتمادش بود رسید از کشتہ شدن او سراسیمگی سراج الدولہ اضعاف مضاعف گشتہ سر تکبر را کہ بر فلک افلاک می سود در گریبان خمول نہید (ص ۱۶۷)

سراج الدولہ کی موت کے ذکر کے سلسلہ میں مصنف کی رائے کا اقتباس اوپر گذر چکا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انگریز تاجروں کے کمال جرأت، پایداری (ص ۱۶۲) جلادت (ص ۱۶۵) بلکہ ان کی مظلومیت و معصومیت (۱۶۴، ۱۵۸) کا ذکر جابجا آیا ہے،

ڈاکٹر عبد السبحان لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب چھ نسخوں کے موازنہ کے بعد ایڈٹ کی ہے، ان میں سے برٹش میوزیم ہی کے نسخہ میں سراج الدولہ کا باب ہے کسی اور نسخہ میں نہیں، اسی سے یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کا یہ باب الحاقی تو نہیں؟ اس کھٹک کو مفصل بحث کے ذریعہ سے دور کرنے کی ضرورت ہی، اس سے قطع نظر سراج الدولہ کے ہلاک کیے جانے کا ذکر ریاض السلاطین میں کچھ مختلف ہے، ظاہر ہے کہ پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کا نقشہ بدل گیا تھا،

اسکے بعد جو بھی تاریخ لکھی گئی اس میں انگریزوں کی طرفداری ضرور کی گئی، پھر بھی ریاض السلاطین میں ہے کہ میر محمد جعفر خاں نے انگریزوں اور جگت سیٹھ کے اشارہ سے قتل کیا، اور اسکی لاش کو ہودج میں ڈالکر لٹکا کر شہر میں گشت کرایا، پھر اس کے چھوٹے بھائی کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا،

سراج الدولہ را از خانۂ دانشاہ گرفتار کردہ بہ اکبر نگر بردند، واز ان جا کسان داؤد علی خاں و میر محمد قاسم خاں ہمراہ خود گرفتہ بہ مرشد آباد بردند، میر محمد جعفر خاں او را آن روز محبوس داشتہ روز دیگر بصوابدید سرداران انگریز و امراء و استبداد جگت سیٹھ مقتولش ساختہ، لاش آں مظلوم را از ہودج آویزاں کردہ در شہر گردانیدہ، در خوش باغ بمقبرۂ نواب مہابت جنگ مدفون ساختند و بعد چندے مرزا احمدی علی خان برادر خورد سراج الدولہ را نیز در تختہ کشیدہ از جان کشتند و بہ پہلوی برادرش بخاک سپردند (ص ۷۴-۳۷۳)

سیر المتاخرین کے مصنف نے بھی انگریزوں سے متاثر ہو کر اپنی تاریخ لکھی ہے، اس نے تو سراج الدولہ کے قتل کا ذکر کرنے ہی سے گریز کیا ہے، بعض انگریز اہل قلم نے سراج الدولہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ یوسف علی خاں سے مختلف ہے، مثلاً کرنل میلسن نے لکھا ہے،

"سراج الدولہ کا تصور کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس نے اپنے آقا سے غداری نہیں کی، اپنے ملک کو فروخت نہیں کیا، جو بھی غیر جانبدار انگریز ہوگا، وہ انصاف کرنے کے لیے بیٹھے گا تو وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ ۹ر فروری سے ۲۳ر جون تک جو واقعات ہوئے ان میں سراج الدولہ کا نام عزت کے ترازو کے پلڑے میں کلائیو کے نام سے زیادہ بھاری ہے، اس المناک ڈرامہ کے تمام اہم کرداروں میں وہ نمایاں ہے، کہ اس نے فریب دینے کی کوشش نہیں کی، (بحوالہ رائیز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا از بی۔ ڈی باسو جلد اول، ص ۲۰۶)

یہ خراج ایک دشمن قوم کے موطن کی طرف سے ادا کیا گیا ہے، لیکن یوسف علی خاں سراج الدولہ کا نہ صرف ہم وطن تھا بلکہ اس سے خاندانی لگاؤ بھی رکھتا تھا، وہ اس کے وجود نابود کو باعثِ مفاسد عظیمہ قرار دیتا ہے، مورخ کے قلم میں بھی عجیب بوقلمونی ہوتی ہے، جو اس کی تاریخ کے پڑھنے والے کے ذہن کو آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔

زیر نظر کتاب کی جانبدارانہ نوعیت کا سوال الگ ہے، اس کے لائق مرتب ڈاکٹر عبد السبحان کی محنت پر حرف نہیں آتا، انھوں نے مختلف نسخوں سے اس کو پوری مشقت سے ایڈٹ کیا ہے۔ وہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی غالباً کر چکے ہیں، اس کی زبان اکبرنامہ، شاہجہاں نامہ اور عالمگیر نامہ کی طرح مشکل نہیں، اس لیے اس کا ترجمہ کرنا زیادہ مشکل نہیں، اگر انھوں نے اس کے ترجمہ کرنے اور اسی کے ساتھ اسکے حواشی لکھنے میں وہی عرق ریزی کی جو ایشیاٹک سوسائٹی کی گذشتہ مطبوعات کے انگریزی ترجموں میں کی گئی ہے تو یہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہوگا،

کتاب کی ضخامت تقریباً ۲۵۲ صفحے ہے، قیمت ۲۵ روپے رکھی گئی ہے، ایشیاٹک سوسائٹی ۱۔ پارک اسٹریٹ کلکتہ سے مل سکتی ہے۔

مطبوعات جدیدہ

مرزا غالب مرحوم کی صد سالہ یادگار کے موقع پر شائع ہونے والے اردو رسالوں کے خاص نمبروں اور کتابوں کا ان صفحات میں پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس کے بعد جو کتابیں اور خاص نمبر آئے ہیں، ان کا اس اشاعت میں تعارف کرایا جاتا ہے، ان میں سے بعض بہت پہلے کے آئے ہوئے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان پر ریویو میں تاخیر ہو گئی۔

العلم غالب نمبر ۔ مرتبہ جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی تقطیع کلاں کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۲ قیمت عـہ ناشر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۸

یہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے سہ ماہی رسالہ العلم کا غالب نمبر ہے، اس ضخامت اور حجم کے چند ہی غالب نمبر شائع ہوئے ہیں، اس میں غالب کی زندگی، حالات فضل و کمال، شاعری انشاپردازی، طرز بیان، جدت ادا، تلامذہ، احباب و معاصرین اور دیوان وغیرہ کے متعلق مختلف عنوانات کے تحت ہندوستان و پاکستان کے ممتاز اہل قلم کے مضامین ہیں، غالب کی عظمت اور شاعرانہ کمالات کے بارہ میں پرانی تحریروں کے اقتباسات اور بعض قدیم کمیاب مضامین بھی درج کیے گئے ہیں، ڈاکٹر ممتاز حسن، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پیر حسام الدین راشدی اور سید ہاشم رضا کے انٹرویو کو ادیب قادری صاحب نے مضامین کا جامہ پہنایا ہے، اتنے ضخیم نمبر میں ناہمواری کا ہونا تعجب انگیز نہیں ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مرزا کو قومی شاعر

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اس زمانہ میں قومیت کا کوئی تصور ہی نہ تھا، اس سے قطع نظر یہ نمبر کیفیت و کمیت دونوں حیثیتوں سے اہم اور غالب کے بارہ میں متنوع معلومات کا عمدہ ذخیرہ ہے۔

اردوئے معلیٰ غالب نمبر حصہ سوم ۔ مرتبہ جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۴۷۲، قیمت معہ، ناشر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۷۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ششماہی "رسالہ اردوئے معلیٰ" نے یکے بعد دیگرے تین غالب نمبر نکالے تھے، زیر نظر تیسرا نمبر غالب صدی کی تقریبات کے سلسلہ میں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے جو دوسرے رسالوں کے غالب نمبروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس میں غالب کے عہد، شخصیت، شاعری، دیوان و معاصرین وغیرہ کے متعلق ہندوستان کے متعدد نامور اہل قلم اور یورپ و امریکہ کے کئی دانشوروں کے بلند پایہ محققانہ مضامین ہیں، ابتدا ہی میں قاری کو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطبے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، جو انھوں نے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں دیے تھے، یہ خطبے نہایت متوازن، دلکش اور بصیرت افروز ہیں، ان میں غالب کی سیرت و شخصیت اور شاعری کا بڑی بالغ نظری اور حقیقت پسندی سے جائزہ لیا ہے، اور ان کی بعض لغزشوں کا اس انداز سے تذکرہ کیا ہے جس سے ان کی فنی عظمت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اور ان نقادوں سے اختلاف بھی کیا ہے جو مرزا کو "رندان قدح خوار" کے بجائے "طبقۂ زہاد" میں شامل کرتے اور ان کی شاعری کو ہر قسم کے حقائق اور ہر عہد کے واقعات کا مخزن قرار دیتے ہیں، خواجہ غلام السیدین کا مضمون بھی خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے تینوں مضامین

ان کے پختہ قلم اور اردو و فارسی شعر و ادب میں انکی بصیرت کے شاہد ہیں، "مسائل تصوف" (میکش اکبرآبادی) اور "غالب کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے مآخذ" (شبیر احمد خاں غوری) فاضلانہ اور محققانہ مضامین ہیں، پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کا دلچسپ مضمون لطف زبان کا نمونہ ہے، فاضل مرتب نے بڑے دلآویز طرز میں غالب کی شخصیت و شاعری میں ترکی و ایرانی عناصر کا ذکر کیا ہے، "غالب کی مابعد الطبیعاتی شاعری" (ڈاکٹر نریش چندر) گو اپنی نوعیت کا نرالا مضمون ہے، مگر وہ خود ما ورائی بن گیا ہے، آخر میں غالب کے متعلق غیر مطبوعہ و کمیاب مطبوعہ کتابوں کے چند اقتباسات اور خود غالب کے تصحیح کیے ہوئے دیوان کے چند صفحے کا عکس ہے، یہ نمبر مواد و معلومات کے لحاظ سے غالبیات میں قابل قدر اضافہ ہے۔

سب رس غالب نمبر۔ مرتبہ جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی، تقطیع کلاں،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۸، قیمت ؎ پتہ ایوان اردو، خیریت آباد حیدرآباد ۴۔

یہ دکن کے مشہور ماہنامہ رسالہ "سب رس" کا غالب نمبر ہے، اسکے حصۂ نثر میں دو مزاحیہ اور غالب کے بعض دکنی تلامذہ کے متعلق بھی مضامین ہیں، صاحبزادے شوکت علی خاں نے اپنے مضمون میں دکھایا ہے کہ غالب اردو شعرا میں سب سے زیادہ میر ممنون سے متاثر تھے، "خطوط نگاری میں غالب کا ایک پیش رو" (اظہر علی فاروقی) میں خواجہ غلام غوث بیخبر کا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے غالب سے بھی پہلے اردو خطوط لکھنا شروع کر دیے تھے، تذکرہ اور انکی خطوط نگاری کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، "لغات غالب" (احمد علی خاں) میں غالب کے چند مخصوص الفاظ، محاورات اور ترکیبوں کا خاکہ دیا گیا ہے، ان کے علاوہ "گنجینۂ معنی کا طلسم اور مافی الضمیر" (ڈاکٹر ابو محمد سحر) "سید ہاشمی اور نسخۂ حمیدیہ" (عبد القوی دسنوی) "حیات غالب" (محی الدین قادری زور) کا

مرحوم وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں، "غالب کی ایک سعی لاحاصل" (حامد اللہ ندوی) میں غالب کی فارسی شاعری کو لاحاصل قرار دینے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے، آخر میں حصہ نظم اور رسالوں کے بعض غالب نمبروں اور غالب سے متعلق کتابوں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، اور شروع میں غالب، ان کے مزار، دیوان کے سرورق، اندرونی صفحے اور بعض تحریروں کا عکس اور چند تلامذہ کے فوٹو ہیں، یہ نمبر محنت و کاوش کا نتیجہ اور لائق مطالعہ ہے۔

غالب فکر و فن ۔ مرتبہ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰ قیمت تحریر نہیں، ناشر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۶۹ء میں غالب پر ایک سیمنار منعقد ہوا تھا، اس میں یونیورسٹی کے ملحقہ ڈگری کالجوں کے اردو اساتذہ کے علاوہ حیدرآباد، دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، بنارس اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں کے اساتذہ نے شرکت کی تھی، زیر نظر کتاب میں اس سیمنار میں پڑھے جانے والے مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، اس میں بالترتیب خواجہ احمد فاروقی، احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے مقالات ہیں، یہ سب مضامین غالب کے بارہ میں مفید معلومات پر مشتمل ہیں، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مغنی تبسم کے مضامین زیادہ مبسوط ہیں، خواجہ احمد فاروقی کا افتتاحی خطبہ بھی مضمون ہے جو اردوئے معلی (سوم) میں ہے، شروع میں مجاہد حسین رضوی نے دلچسپ انداز میں سیمنار کی روداد سنائی ہے، اس مجموعہ کی اشاعت پر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی خصوصاً اس کے لائق صدر قابل مبارکباد ہیں۔

"ض"

۲۴۱

جلد ۱۰۸ ۔ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۱ء ۔ عدد ۴

مضامین